

# هفت رنگ

عرشِ ملیانی

طارق کی نذر

شش ماہی

۱۹۵۱  
یک ماہ

۱۹۵۱-۱۹۵۲



پبلشر :- مرکز تصنیف و تالیف نکودر (جاندھر)

پرنٹر :- دیال پرنٹنگ پریس فوارہ دہلی

طے کاپتہ :-

ہندوستان میں :- رہنمائے تعلیم بک ڈپو مفتی والان دہلی

پاکستان میں :- شیخ محمد اسماعیل پانی پتی دفتر رہنمائے تعلیم لاہور ۳۳ لاہور

ایک ہزار

۱۹۵۱ عیسوی

باراول

قیمت تین روپے



# توس قزح

۴۶	بازماند ساز	۱۸	پہلا رنگ — خونِ آدم
۵۱	دوسری جنگِ عظیم	۲۲	جہل کی رات
۵۲	رشوت کا بازار	۲۴	کم ظرفِ دنیا
۵۶	شہیدِ عظیم	۲۶	غم ماحول
۵۹	جیون وان	۲۹	انتباہ
۶۴	خدا اور انسان	۳۳	اشرف المخلوقات
۱۱۲ تا ۶۵	غزلیات	۳۶	تیور تو دیکھ زمانے کے
۱۱۴	آدمِ شباب	۳۹	درویش کی دنیا
۱۱۶	کلفٹن	۴۱	جب آدمی وحشی بن گیا
		۴۴	انقلاب
		۴۸ تا ۱۹۴	جشنِ آزادی

۱۶۶	رباعیات	۱۲۰	بیس کیوں بھول جاؤں
۱۶۴	دور چلے	۱۲۲	کل رات سے
۱۶۵	جھوم کے پی	۱۲۴	دور عیش
گیّت	ساتواں رنگ —	سوز و گداز	چوتھا رنگ —
۱۶۸	کسان کا گیت	۱۳۰	بیوہ کی فریاد
۱۶۹	چھوڑ بھی دے اوکھیں ہار	۱۳۲	محبوب کا آخری خط
۱۸۱	میرے سن کی آشا جاگ	۱۳۸	سہاگن بیوہ
۱۸۲	اندھا نیاٹے	۱۴۴	جو گن بھرے اداس
۱۸۳	نزد صحن کا دکھ جانے کون	پانچواں رنگ —	منقرفات
۱۸۴	من کی بات	۱۴۶	رازِ بقا
۱۸۵	ہمارا دلش	۱۵۱	نعرۂ مزدور
۱۸۸	پن گھٹ	۱۵۵	امیروں کی دنیا
۱۸۹	دیپک تلے اندھیرا	۱۵۸	عرضِ حقیقت
۱۹۱	جیون کا درپن دیکھ لیا	خرابات —	چھٹا رنگ
	—	۱۶۲	اے پیرِ خرابات

## تعارف

### شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

”لائق باپ کا لائق بیٹا“ یہ بہت ہی شاذ سننے میں آتا ہے۔ مجھے یہ محسوس کر کے بہت خوشی ہوتی ہے کہ حضرت جوش ملیح آبادی کے فرزند عرش صاحب لائق باپ کے لائق بیٹے کہ جانے کے بہر صورت ہی نہیں، بہ حسن الوجہ مستحق ہیں

حضرت جوش ملیح آبادی پنجابی ہیں اور یہی نہیں، پنجاب کے ایک گاؤں نکودر میں انھوں نے اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ گزارا اور آج بھی وہیں مقیم ہیں۔ آپ نے کبھی دہلی میں رہے، نہ لکھنؤ میں، لیکن زبان کے دونوں مرکزوں اور اہل زبان کی صحبتوں سے کوسوں دور رہنے کے باوجود آپ کی زبان اس قدر پاکیزہ و رواں اور آپ کی فنی معلومات اس قدر استوار و پختہ ہے کہ آپ کو نہایت آسانی کے ساتھ اساتذہ اہل زبان کی صف میں جگہ دی جاسکتی ہے۔

یہی حال عرش صاحب کا ہے۔ پہلے نہروں کے محلے میں بہتے پھرے۔ پھر پنجاب کے مدارس میں ایک زمانے تک مدرسہ کرتے رہے اور اس کے بعد سرکاری دفاتر کی فائلوں کے مدتِ دراز تک مرکب بنے رہے، لیکن ان تمام غیر شاعرانہ جادوں پر گامزن



رہنے کے باوجود ذوقِ سخن سے کبھی غافل نہیں رہے۔

دار و رسن کی زد پہ بھی دم ٹوٹتا نہیں

جبلِ متین زلفِ رسا چھوٹتا نہیں

ادیہِ جبلِ متین "چھوٹتا بھی تو کیوں کر" قدرت نے عرشِ صاحب کو اس فرش پر بھیجا ہی اس لئے تھا کہ وہ گیسو سے ذوقِ سخن میں گرفتار رہیں اور ع کہ بستگانِ کندہ تو رسدگار اند کا آواز بلند کریں۔

عرشِ صاحب سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں، فن کی پابندی کا سختی کے ساتھ لحاظ کرتے اور مغائبِ شعری سے دور رہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں روح اور بیان میں حرارت پائی جاتی ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کی اکثر نظموں میں مغز اور تفکر کے بسیاں آشکار ملتے ہیں۔

اس دور میں جب کہ زبان و بیان اور فنی پابندیوں سے شعراء آزاد ہو چکے ہیں اپنی کمزوریوں اور اپنے غجز پر جدتِ طرائیوں کے پردے ڈال رہے ہیں، عرشِ صاحب کا ان امور پر استغفال و اصرار اور ان پابندیوں میں رہتے ہوئے ان کی خوش گفتاری و شیریں نوائی ہزار ہا تحیں و آفریں کے شایاں ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ عرشِ صاحب کا مجموعہ خصوصیت کے ساتھ ان سخنِ سنج عالمانِ علم و ادب کے واسطے ایک غیر مترقبہ چشمہ شیریں ثابت ہو گا جن کے کام و دہن کو آزاد قسم کے شعراء کی آزاد نوائیوں سے تلخی و ترشی محسوس ہو رہی ہے۔ اور وہ فرطِ مسرت

سے کہہ اٹھیں گے کہ :-

پس از مدت گزرا فستاد بر ما کار و آنے را

جوش

دہلی ۱۲/۵۶

### علامہ پنڈت برج موہن دتتا تریہ کیفی

آج کل معاشرت کے ہر شعبے میں قدریں کچھ سے کچھ ہو رہی ہیں۔ معیار بدل رہے ہیں۔ نئے نئے پیمانے نکل رہے ہیں۔ ادب میں بھی یہی گما گمی مچی ہوئی ہے۔ پرانے معیاروں کو ناقص بتایا جاتا ہے۔ نئے ابھی اپنی صحت ثابت نہیں کر پائے۔ اور تو اور انسان کا نفس اور شعور ہی ایک زیر بحث امر ہے۔ ان صورتوں میں کسی شاعر کے کلام کا تعارف کرنا ایک مشکل کام ہے۔ مگر اس کا کیا جواب کہ جس شاعر کے کلام کا تعارف مجھے منظور ہے وہ پُرانے اور نئے دونوں قسم کے خیالات کے لوگوں میں ہر دل عزیز ہے۔ یہ ہیں پنڈت بال کمنڈی اے عرش طیسانی۔

ایک اچھے شاعر یا استاد کا بیٹا بھی اچھا شاعر ہو یہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اسے ادبی دنیا کے قانون وراثت کے مستثنیات میں سے سمجھنا چاہیئے۔ مگر میرے دوست حضرت جوش طیسانی شاگرد رشید حضرت داغ کو بہت خوش قسمت سمجھنا چاہیئے کہ انھیں قدرت نے عرش جیسا فرزند عطا کیا۔ فارسی کی کہاوت ہے ع گرا رث پدر تو اہی علم پدر آموز۔ عرش کو اپنے والد ماجد کی ادبی میراث کا پورا حق ہے کیونکہ انھوں نے ”علم پدر“ پر عبور حاصل کر لیا ہے۔

عرش صاحب اس وقت بیالیس سال کے ہیں۔ انھوں نے اپنی عمر عزیز کے ان بیالیس



سائوں کا صرف نہایت ہوش مندی سے کیا۔ ان کے شعور کی صحت کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ انھوں نے اپنے بطنی رجحان کا صحیح اندازہ کیا اور جبلت کے تقاضوں کی مزاحمت نہ کی۔ جیسی تو اور سیری سے زندگی شروع کر کے غرش اس وقت ادب اور شاعری کی دنیا کے ایک درخشاں ستارے مانے جاتے ہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے۔

رواج تھا کہ زندہ اور جوان شاعر کے کلام پر تبصرہ نہیں کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ آگے چل کر اونچائی کو پہنچ کر نہ معلوم شاعر کی طبیعت کیا رنگ اختیار کرے گویا وہ آم کو ڈالی ہی پر پکنے کا موقع دینا مناسب خیال کرتے تھے۔ لیکن عرش صاحب کا کلام تو خاصا پختہ ہو چلا ہے اور پھر صیحا کہے کہا گیا ہے پرانی روایات کو آجکل کون مانتا ہے۔ بہر حال اس تعارف کو تبصرہ یا نقد و نظر نہ سمجھنا چاہئے۔ عرش صاحب اگرچہ زیر دست اور سیر حاصل مضامین بھی لکھتے ہیں لیکن یہاں صرف ان کی شاعری کا ذکر کیا جائے گا چونکہ ان کی تعلیم میں مشرقی اور مغربی دونوں ادب داخل تھے۔ مذاق سلیم اور طبیعت ہنرمند تھی۔ انھوں نے دونوں کے محاسن کو اپنے کلام میں سمو لیا جیسا اثر اور پورچ ان کی غزل میں ہے ویسا ہی زور اور وقت نظر ان کی نظمیں میں ہے۔ گیت بھی خوب لکھتے ہیں۔ ان میں تاثر اور روانی قابل تعریف ہے۔ پاکیزہ جذبات کے ساتھ موسیقیت بھی خوب ہے۔ یہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں فصیح ہوتا ہے۔ زبان اور محاورے کی دل آویزی، اسلوب کی چستی، تخیل کی بلندی اور جذبات کی پاکیزگی اور حسن ادا ان کے کلام کے خاص اوصاف ہیں۔ ان کے خیالات کا پس منظر خواہ کچھ ہی ہو وہ بیان کی کلاسیکل خوبی اور دل کشی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور یہی امتیاز انھیں اپنے ہم عمر شاعروں سے الگ کرتا ہے :



## درسِ خود می گویم

۲۰ ستمبر ۱۹۵۰ء کو عمر کا تینٹا لیسواں سال شروع ہو گیا۔ اس مدت میں زندگی نے بہت

اتار چڑھاؤ دیکھے۔ نصف مدت تو سرکاری ملازمت کے قفس میں گزری ہے۔ ابھی میعادِ قید ختم نہیں ہوئی۔ جنابِ محرم کا یہ مصرع اس زمانے کی صحیح تصویر ہے۔

یہ سنگاں ادب نمودم بنسراں سلام کر دم

کارِ کی تعلیم کے زمانے میں گورنمنٹ انجینئرنگ اسکول رسول میں داخل ہوا، اور سیرینا

تین بار اس ملازمت کو چھوڑا۔ ذوقِ شعر و ادب کا زندگی پر یہ پہلا نمایاں اثر تھا۔ پھر صنعتی

اسکول میں مدرس ہوا، اس کے بعد حکومت ہند کے دفتروں میں کئی سال گشت کرتا رہا۔

آج کل آج کل سے وابستہ ہوں۔ شعر کا ذوق فطری ہے۔ فیضانِ والد محترم کا ہے۔ بتبع

کسی کا نہیں کیا اور نہ کسی سے تلمذ ہے۔ ریڈیو بازی اور مشاعرہ بازی رسوائی کی حد تک کر

چکا ہوں اور ابھی تک اس اضطراب کی کسک باقی ہے۔ نثر میں بھی لکھتا رہتا ہوں۔

کسی ادبی گروہ سے وابستہ نہیں ہوں، بقول جوش

حرم برگشتہ ہے اور دیر بدظن

خود اپنا آستان ہے اور میں ہوں

شعر کہنے کی خاطر شعر کہہ لیتا ہوں۔ وقت کے تقاضوں اور تحریکاتِ حاضر سے روگرداں نہیں  
عام انسان سے ہمدردی میرا ملج نظر ہے۔ لیکن ذہنی عقائد کو عملی صورت دینے سے کسی حد  
تک قاصر رہا ہوں۔ اسے مصلحت پر معمول فرمائیے یا بزودی پر — ضرورت سے زیادہ خودداری  
اور ذہانت کے باب میں احساسِ برتری کے ہاتھوں اکثر ذلیل بھی ہوا ہوں لیکن خلوصِ قلب  
کے سہارے یہ ذلت خندہ پیشانی سے گوارا کر لی ہے۔ شہرت کے دروازے پر دریوزہ گری  
کے ڈھنگ سیکھنے کی کوشش کے باوجود نہیں آئے۔ اپنی تعریف پر دوسروں کو آمادہ کرنا تو  
گیا کبھی ایسے الفاظ سن کر بھی مسرت حاصل نہیں کی۔ اپنے کردار پر نقد و تبصرہ کرنے کی  
اہلیت نے دوسروں کے نقد و تبصرہ کا کم محتاج رکھا ہے۔ حق بات پر اڑنے کی عادت ہے  
لیکن یہ دعوئے نہیں کر سکتا کہ اس راہ پر پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی۔  
مصلحت بینی اور توازنِ مزاج کے خزانوں سے حصّہ وافر نہیں تو کچھ کم بھی نہیں پایا۔ اس  
لئے دنیاوی معاملات میں اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی اپنی رائے کو بیشتر  
کارآمد پایا ہے۔ ڈرتا ہوں کہیں یہ نثری قبیضہ طویل نہ ہو جائے، اس لئے

اب شعر کے موضوع یا موضوع شعر کی طرف آتا ہوں۔

ادب برائے فن یا فن برائے ادب یا رشید احمد صدیقی کے قول کے مطابق دونوں برائے تفسن کی بحث ایک ذہنی عیاشی بھی لیکن ہر فن کار کو ایک لائحہ فکر متعین کرنا ضروری ہے۔ اضطراری اور فراری طرزِ عمل سے وہ خود کو اس مبحث سے مامون و مصون نہیں کر سکتا۔ میں نے خود اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا ہے اور ایک ایسے واضح نقطہ نظر پر پہنچا ہوں جہاں یہ دونوں نظریے مفروضات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور وہ مقام ہے ادب برائے زندگی کا مقام۔ ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کی بحث میں اُلجھنا اس لئے لاعاصل سمجھتا ہوں کہ یہ بحث ہی بے بنیاد ہے۔ ادب برائے ادب کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اظہارِ مطالب میں شاعر لاکھ مختار و آزاد رہی لیکن ماحول و وراثت سے متاثر ہونا اس کے لئے ضروری ہے۔ زندگی سے کسی ادب کو یا ادیب کو مفرہی نہیں۔

آج کل ترقی پسندی اور رجعت پسندی کا عام چرچا ہے۔ بات یہاں تک پہنچی ہے کہ خود ترقی پسندوں کو مہمل گو کا خطاب عطا کرنے والے اس بات کے متمنی ہیں کہ انھیں ترقی پسند کہا جائے۔ روایتی شاعری اور اُس کا میکا نکی اندازِ قبولیت کی بارگاہ سے بے یک بینی و دو گوش نکال دیا گیا ہے۔ وہ اسی کا اہل بھی تھا۔ بیسویں صدی کے پہلے پچاس سال تاریخِ عالم میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ تہذیب



کسی ادبی گروہ سے وابستہ نہیں ہوں، بقول جوش

حرم برگشتہ ہے اور دیر بدظن

خود اپنا آستان ہے اور یس ہوں

شعر کہنے کی خاطر شعر کہہ لیتا ہوں۔ وقت کے تقاضوں اور تحریکاتِ حاضر سے روگرداں نہیں عام انسان سے ہمدردی میرا طبعِ نظر ہے۔ لیکن ذہنی عقائد کو عملی صورت دینے سے کسی حد تک قاصر رہا ہوں۔ اسے مصلحت پر محمول فرمائیے یا بزدلی پر۔ ضرورت سے زیادہ خودداری اور ذہانت کے باب میں احساسِ برتری کے ہاتھوں اکثر ذلیل بھی ہوا ہوں لیکن خلوصِ قلب کے سہارے یہ ذلت خندہ پیشانی سے گوارا کر لی ہے۔ شہرت کے دروازے پر دریوزہ گمری کے ڈھنگ سیکھنے کی کوشش کے باوجود نہیں آئے۔ اپنی تعریف پر دوسروں کو آمادہ کرنا تو کجا کبھی ایسے الفاظ سن کر بھی مسرت حاصل نہیں کی۔ اپنے کردار پر نقد و تبصرہ کرنے کی اہلیت نے دوسروں کے نقد و تبصرہ کا کم محتاج رکھا ہے۔ حق بات پر اڑنے کی عادت ہے لیکن یہ دعوے نہیں کر سکتا کہ اس راہ پر پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ مصلحتِ بینی اور توازنِ مزاج کے خزانوں سے حصّہ وافر نہیں تو کچھ کم بھی نہیں پایا۔ اس لئے دنیاوی معاملات میں اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی اپنی رائے کو بیشتر کارآمد پایا ہے۔ ڈرتا ہوں کہیں یہ نثری قصیدہ طویل نہ ہو جائے، اس لئے

اب شعر کے موضوع یا موضوع شعر کی طرف آتا ہوں۔

ادب برائے فن یا فن برائے ادب یا رشید احمد صدیقی کے قول کے مطابق دونوں برائے تفسیق کی بحث ایک ذہنی عیاشی ہی لیکن ہر فن کار کو ایک لائحہ فکر متعین کرنا ضروری ہے۔ اضطراری اور فراری طرزِ عمل سے وہ خود کو اس مبحث سے مامون و مصئون نہیں کر سکتا۔ میں نے خود اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا ہے اور ایک ایسے واضح نقطہ نظر پر پہنچا ہوں جہاں یہ دونوں نظریے مفروضات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور وہ مقام ہے ادب برائے زندگی کا مقام۔ ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کی بحث میں الجھنا اس لئے لاعاصل سمجھتا ہوں کہ یہ بحث ہی بے بنیاد ہے۔ ادب برائے ادب کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اظہارِ مطلب میں شاعر لاکھ مختار و آزاد ہوں لیکن ماحول و وراثت سے متاثر ہونا اس کے لئے ضروری ہے۔ زندگی سے کسی ادب کو یا ادیب کو مفری نہیں۔

آج کل ترقی پسندی اور رجعت پسندی کا عام چہرہ چاہے۔ بات یہاں تک پہنچی ہے کہ خود ترقی پسندوں کو مہمل گو کا خطاب عطا کرنے والے اس بات کے متمنی ہیں کہ انھیں ترقی پسند کہا جائے۔ روایتی شاعری اور اس کا میکا نکی اندازِ قبولیت کی بارگاہ سے بہ یک بینی و دو گوش نکال دیا گیا ہے۔ وہ اسی کا اہل بھی تھا۔ بیسویں صدی کے پہلے پچاس سال تاریخِ عالم میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ تہذیب

اور علم کی قدریں اس سے پہلے کبھی اس تیزی سے تبدیل نہیں ہوئیں جتنی اس مدت میں۔ جس ادیب اور فن کار نے اس تیز رفتار تبدیلی کا ساتھ نہیں دیا وہ پیچھے رہ گیا۔ حیرت کا مقام یہ ہے کہ خود اسے اس بات کا احساس نہیں ہوا۔ عقائد اور نظریوں کے اس طوفان میں کتنے ادیب ہیں کہ بے محایا بہ گئے اور یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ اپنے مزاج اور تفکر کا توازن بھی قائم رکھ سکے ہیں یا نہیں۔ غرض ایک انتشار کا عالم ہے۔ صراحت سے کہوں تو کہنا پڑے گا۔ وہ لوگ جو نظامِ عالم میں ایک ایسی خوش آئند تبدیلی چاہتے ہیں جس سے غریب اور مردود کو صرف پیٹ بھر کر روٹی ہی نصیب نہ ہو بلکہ قدرت کی فیاضیوں سے وہ اتنا ہی فیض یاب ہو سکے جتنا کوئی اور شخص، یہ فوٹے ابھی صادر کر چکے ہیں کہ مارکسی نظامِ معاشرت پر یقین نہ رکھنے والا اس دور میں ترقی پسند نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک تو خیر قباحات نہیں اس سے بھی ایک قدم آگے وہ قولِ فیصل ہے کہ وہ فن کار جو اپنے قول و عمل سے سارے عالم کے نظامِ معاشرت پر مارکس کی مہر ثبت کرنے میں معاون نہیں ہوتا رجعت پسند ہی نہیں بلکہ مردود ہے، اگر دن زہنی ہے۔

ان تمام مسائل سے قطع نظر میں نے عظمتِ اولادِ آدم اور انسان کی عام محبت کو اپنا مطمح نظر بنایا ہے۔ مذہب کی چیرہ دستیوں اور امن گش فساد انگیزیوں اور جنگِ فریبیوں کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ پچھلے پچیس سال میں دنیا میں حیرت انگیز تبدیلیاں آئیں۔ سیاست و



معاشرت کے باب میں بہت سے پُرانے بُت ٹوٹ گئے۔ انقلاب و بغاوت کی چنگاریاں ایک بھیانک آگ بن گئیں جس نے قدامت کے فرسودہ نظام کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ آج سے قریب قریب پچیس سال پہلے میں نے سو فیصدی روایتی شاعری سے شعر گوئی شروع کی اور اب ایسے مقام پر پہنچا ہوں کہ گو روایت کا اسیر نہیں لیکن میری تخلیقات میں روایت کے عناصر مفقود بھی نہیں۔ اتنی سوجھ بوجھ ضرور پیدا ہو گئی ہے کہ اگر اسی نیم روایتی ڈگر پر استقلال سے چلتا رہا تو شاید یہ استقلال، استقلالِ مرگ بن جائے گا۔ میری بہت سی مثال کی نظمیں اس احساس کی آئینہ دار ہیں۔ اُن میں سے بہت کم اس مجموعے میں شامل ہو سکی ہیں۔ لیکن اُن سے اتنا ضرور مترشح ہوتا ہے کہ دل و دماغ پر تبدیلی کا ایک جنوں مسلط ہے۔

مجھے وہ شاعری پسند نہیں جس میں مار دھاڑ اور پکڑ و مٹکڑ کی تلیقن یا لوٹ کھسوٹ اور غارت گری کے نعرے ہوں۔ اظہارِ مطالب کے باب میں عجزِ طبیعت کو غلط زبان اور غلط ترکیبوں کی "جدت آفرینوں" سے چھپانا میرے نزدیک مستحسن نہیں۔ وہ شاعری جو شعریت سے خالی ہے جس میں رس اور لوچ نہیں جو موسیقی اور مصوری سے مبرا ہے۔ تصنیع اوقات کے سوا کچھ نہیں۔

اس مجموعے میں کچھ گیت بھی شامل ہیں۔ اُن میں زیادہ تر وہی زبان استعمال کی

ہے جو گیت کے لئے موزوں ہو سکتی ہے۔ شمالی ہندوستان کے عام دیہاتی گیت میٹھی اور پیاری ہندوستانی زبان میں ہیں اس لئے فارسیت زدہ اردو کے شیداؤں سے یس اس باب میں مندرت چاہوں گا۔

لا ابالی قسم کی بے راہ روی کا یس قائل نہیں۔ محض ترقی پسند کہلوانے کی خاطر ہر پُرانی چیز پر لعنت بھیجنے کے لئے طیار نہیں۔ اپنی کم مائیگی کا احساس ہر وقت رہتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے شعر کی جنس کا سد کو منتقم سمجھتا ہوں۔ کیونکہ حاجی اور ملا کوئی قسم کے پراپیگنڈے کا مللح اسے نظر فریب تابنا کی عطا نہیں کر رہا۔

ہفت رنگ اسم بامسمیٰ ہے۔ اس میں سات رنگ ہیں۔ مجھے سرت ہے کہ پرکھنے والوں نے تعزیر کو اس میں نمایاں دیکھا ہے۔ میں نے قریب قریب ہر صنف سخن میں کچھ نہ کچھ کہا ہے لیکن یہی رنگ میرا محبوب رنگ ہے۔ ردیف اور قافیے کی خوش آہنگی سے کان اب اس قدر آشنا ہو گئے ہیں کہ نظم آزاد میں مجھے وہ دلاویزی نظر نہیں آتی جو پابند نظم کا حصہ ہے۔ پھر بھی بہت سی آزاد نظموں کے مطالعے کے بعد اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ اظہار مطالب اور تسلسل بیان کے لئے یہ صنف بہت موزوں ہے اور اس کا مستقبل بہت اُمید افزا ہے۔

نئے لکھنے والوں میں جوش ہے، ولولہ ہے، انہوں نے ایسے ماضی کو کم دیکھا

ہے جو فرمودہ اور قدامت پرست تھا۔ اس لئے انھیں ان لوگوں پر انگشت نمائی

نہیں کرنی چاہیے جن کے کلام سے روایت و قدامت ابھی مٹ نہیں گئی۔

اس اُمید پر ہفت رنگ کو قدر شناسوں کے سپرد کرتا ہوں کہ اس کا ایک شعر

بھی اگر انھیں پسند آئے گا تو میری کوشش مشکور ہو جائے گی۔

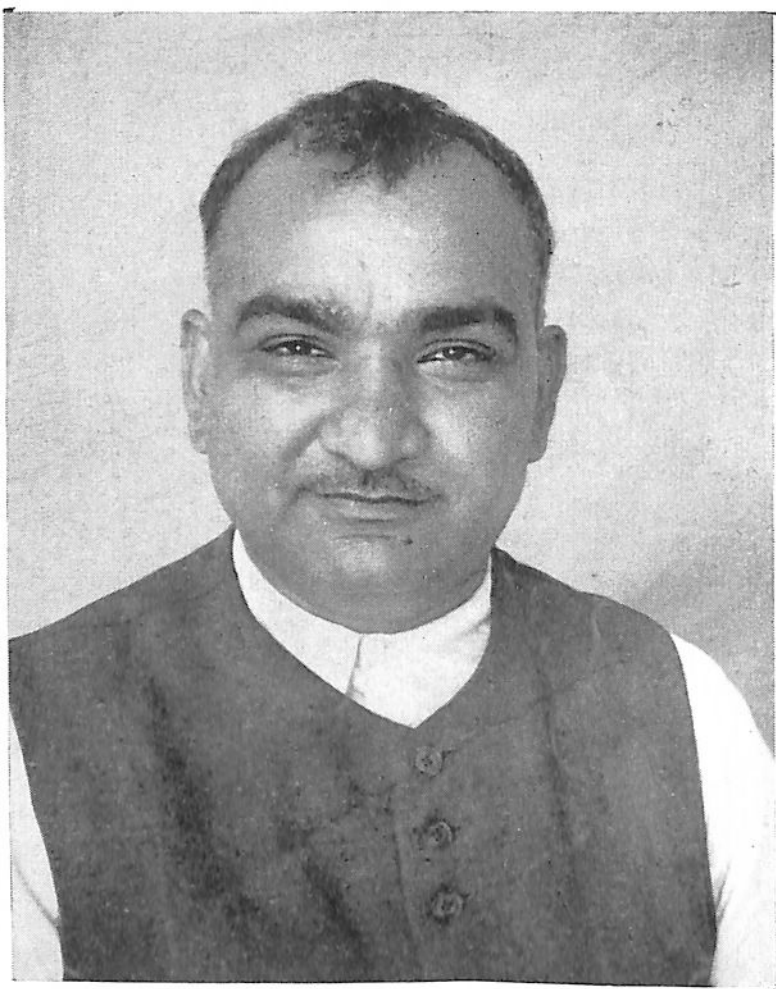
چو بیتے پسند آیدت از ہزار

مردی کہ دست از نفقت بدار

عرش ملیانی







شعر و شریع و عرش از هم ساختند  
این در عالم از سه حرف آراستند  
عطار





# خونِ آدم

جہانے تیرہ تراز آفتابے

صوابے اور اپاناصوابے

ندامت کج ویرانہ را

دہی از خونِ آدم رنگے آجے

(اقبال)

# جہل کی رات

عقل کی جُح کہاں جہل کی ہے رات ابھی  
 ذہنِ انساں میں ہیں فرسودہ خیالات ابھی  
 پائے عالم ہیں ہے زنجیرِ قدامت اب تک  
 گردِ دہر میں ہے طوقِ روایات ابھی  
 طاقتِ جستِ عمل سے ہیں ابھی دل محروم  
 زینہٴ عقدہ کشائی ہے مناجات ابھی

دل میں انسان کے ہے وحشتِ اشتراق ہنوز  
 ثبتِ اذہان پہ ہے مُہرِ کرامات ابھی  
 رُوحِ احساس پہ ہے گردِ تنک مایہ ہنوز  
 دوشِ افکار پہ ہے زُلفِ خرافات ابھی  
 جنتِ "خوب" میں ہے شیخ کا ہر قول ہنوز  
 دوزخِ زشت میں ہے رند کی ہر بات ابھی  
 مُنعم بہیہ ہے مرکزِ انعام اب تک  
 مفلسِ غمزدہ ہے موردِ آفات ابھی  
 خونِ مزدور ہے ارزاں ابھی پانی کی طرح  
 بہرِ سرمایہ ہے یہ مُفت کی سوغات ابھی

غیب سازوں سے ہیں افسر و ہنرمند اب تک  
 نقص بازوں سے ہیں آزر و کمالات ابھی  
 دہر میں جو ہر قابل کی نہیں قدر کہیں  
 بچتے ہیں جاہ و حشم کے سہل ولات ابھی  
 رہرو راہ تعقل کا خسرا حافظ ہے  
 راہ میں وہم کے لاکھوں ہیں مقامات ابھی  
 خاکہ حسن ابھی ذہن تصور میں نہیں  
 خام تخیل ہے محروم محاکات ابھی  
 ابھی آئینہ افکار نہیں پیش نظر  
 دل ہے نظارگی جلوہ آیات ابھی



ابھی ممنوع ہے دارائی شرح و تفسیر  
 ناز فرما ہیں اشارات و کنایات ابھی  
 خندہ دلکش و گلہ ستہ رنگیں کے عوض  
 تنجرو تیغ سے ہوتی ہے مدارات ابھی  
 آشیاں امن کا اب تک نہیں مسجودِ بشر  
 آستانِ جنگ کا ہے قبیلہ حاجات ابھی  
 گمرہ زلیست کے ہیں عقدہ کشا ناخن مرگ  
 خدمتِ امن میں داخل ہیں فسادات ابھی  
 عرش کیوں خواب سے بیدار ہوا جاتا ہے  
 بند کر آنکھ کہ باقی ہے یہاں رات ابھی

# کم طرف دنیا

یہ دورِ خرد ہے دورِ جنوں اس دور میں جینا مشکل ہے  
 انگوڑی مے کے دھوکے میں زہراب کا پینا مشکل ہے  
 جب ناخن وحشت چلتے تھے روکے سے کسی کے رُک نہ سکے  
 اب چاکِ دلِ انسانیت سیستے ہیں تو سینا مشکل ہے  
 جو دھرم پہ بیتی دیکھ چکے ایماں پہ جو گزری دیکھ چکے  
 اس "رام و رحیم" کی دُنیا میں انسان کا جینا مشکل ہے



اک صبر کے گھونٹ سے مٹ جاتی سب تشنہ لبوں کی تشنہ لبی  
 کم ظرفی دُنیا کے صدقے یہ گھونٹ بھی پینا مشکل ہے  
 وہ شعلہ نہیں جو بجھ جائے آندھی کے ایک ہی جھونکے سے  
 بجھنے کا سلیقہ آساں ہے جلنے کا قرینہ مشکل ہے  
 کرنے کو رفو کر ہی لیس گے دُنیا والے سب زخم اپنے  
 جو زخم دلِ انساں پہ لگا اُس زخم کا سینا مشکل ہے  
 وہ مرد نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونیں منظر سے  
 اُس حال میں جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہے  
 ملنے کو ملے گا یا آخر اے عرش سکونِ ساحل بھی  
 طوفانِ حوادث سے لیکن بچ جائے سفینا مشکل ہے

# غم ماحول

چلیں گی دہریں بربادیوں کی آندھیاں کبت تک  
 چراغِ عظمتِ آدم نہ ہوگا ضوفاں کبت تک  
 نظامِ برہم عالم کا ماتم تا بہ کئے ہوگا  
 رہے گا سرنگوں تنظیمِ انساں کا نشاں کبت تک  
 تو ہم کوٹے گا نام کبت تک عقل و دانش کا  
 غبارِ راہ پر ہوگا گھمان کا رواں کبت تک

چلے گی بحث کب تک دوزخ و جنت کے جھگڑوں کی  
 رہے گی عقلِ انساں بتلائے این و آں کب تک  
 وہ انساں جو رانساں سہہ کے بھی جواں نہیں کرتے  
 نہ سمجھی جائے گی اُن بے زبانوں کی زباں کب تک  
 فرغ جاں نہ ہوگی روشنی کب تک بصیرت کی  
 رہیں گے داغِ دل بن کر جہالت کے نشاں کب تک  
 ہنسی کب تک اڑے گی عظمتِ اولادِ آدم کی  
 رہے گی آدمیت ایک جنسِ رائگاں کب تک  
 کبھی تو چھپیڑ سا نہ دل پہ کوئی پُر اثر غم  
 غم ماحول میں اے عرش یہ آہ و فغاں کب تک



## انتباہ

سُکھ کی گردن کاٹ رہی ہے دنیا کی تلوار تو دیکھ

جس تلوار کو چوم رہا ہے اُس تلوار کی دھار تو دیکھ

جان یہاں ہر چیز کی قیمت آن یہاں ہر چیز کا مول

سودا کرنے والے غافل پہلے یہ بازار تو دیکھ

چھوٹ چکیں تہذیب کی نبضیں تجھ کو لیکن ہوش نہیں  
 فکرِ درماں سے پہلے تو رنگِ رُخِ بیمار تو دیکھ  
 ڈنک نہایت زہریلے ہیں مذہب اور سیاست کے  
 ناگوں کی نگری کے باسی ناگوں کی پھنکار تو دیکھ  
 اس کی زد میں جو بھی آیا خاک ہوا برباد ہوا  
 یہ تہذیب کا فتنہ اور اس فتنے کی رفتار تو دیکھ  
 کتنے تیر گئے ہیں اس کو کتنے اس میں ڈوب گئے  
 کھیل نہیں ہے جیون ساگر تو اس کے اُس پار تو دیکھ  
 کند چھری ہے اور اس سے مظلوم کی گردن کٹتی ہے  
 عیش کی حسرت تو یہ تو بہ اندازِ آزار تو دیکھ

نازک کشتی نازک چپو اور اس پر طوفان کا زور  
 پار کرے گا دریا کو تو اپنی جان زار تو دیکھ  
 عرش کہاں تک آخر یہ پُر لطف سُہانی اُمیدیں  
 خوش فہمی پر پھول نہ اتنا کیسے ہیں آثار تو دیکھ

۱۹۴۳

ہرول پہ ہے اک ہول سراسر تسلیم  
 اب قول نہیں قول سراسر تسلیم  
 شیطان پہ لا حول سراسر باطل  
 انسان پہ لا حول سراسر تسلیم

۱۹۴۷

## ”اشرف المخلوق“

اے حالِ پریشانِ جہاں دیکھنے والو  
 اے نبضِ جوانانِ جہاں دیکھنے والو  
 دیکھو تو ذرا یہ قفس و دام کی دُنیا  
 آزار کی دُنیا غم و آلام کی دُنیا



تہذیب پہ تخریب ستم توڑ رہی ہے  
 ہمت ہے کہ ہر گام پہ جی چھوڑ رہی ہے  
 یہ ٹینک، یہ بم اور یہ توپوں کے دہانے  
 بے ہیزی انساں کے سناتے ہیں فسانے  
 خونخواری انساں کی یہ گھاتیں ہیں قیامت  
 اس اشرف مخلوق کی باتیں ہیں قیامت  
 جو بات ہے اس کی وہ درندوں سے فزوں ہے  
 یہ جنگ کی خواہش ہے کہ شیطان کافسوں ہے  
 تہذیب کے ضامن بھی ہیں تہذیب کے دشمن  
 اپنے بھی پرائے ہیں تو رہبر بھی ہیں رہزن

پامال کئے جاتی ہے رفتارِ زمانہ  
 مظلومی اقوام کی حد ہے نہ ٹھکانہ  
 یہ حرب کے آلات یہ سامان فنا کے  
 یہ فتنے قیامت کے یہ طوفان بلا کے  
 بڑھتی ہوئی چڑھتی ہوئی یلغار تو دیکھو  
 فتنے کی ذرا گرمی بازار تو دیکھو  
 اے اہل وطن اپنے وطن کے ہوا میں تم  
 خاتم ہے اگر اس کی محبت تو نگیس تم  
 اٹھو کہ اب ایسے میں تو سونا نہیں اچھا  
 طوفان میں یوں جی کو ڈبونا نہیں اچھا

آپس کی لڑائی کا گماں تک بھی نہ چھوڑو

اب بغض و عداوت کا نشان تک بھی نہ چھوڑو

اربابِ عرض کو بھی ہمدرد نہ سمجھو

کیٹے کے جو ہیں مرد انہیں مرد نہ سمجھو

۱۹۴۲

# تور تو دیکھ زمانے کے

ہر بات میں آپادھانی ہے چالاکی ہے طراری ہے

دنیا کے فسانے کا عنوان مکاری ہے عیاری ہے

افسوس کہ ایسی دنیا میں تو مست نے خود داری ہے

تور تو دیکھ زمانے کے

راحت کا یہاں اب کام نہیں یہ دور ہے رنج و مصیبت کا

معصوم کی گردن کٹتی ہے صبح اک ہے دامن عصمت کا



ہے ناز شرافت پر تجھ کو ذلت ہے مول شرافت کا

تیور تو دیکھ زمانے کے

زہریلے ڈنک چلاتے ہیں دنیا پر یہ دُنیا والے

گوری قوموں کی چاندی ہے معتبَرِ مہرِیں کالے

تو کیوں ہے عمل سے بیگانہ اے کیفِ خودی کے متوالے

تیور تو دیکھ زمانے کے

جو خود منزل سے غافل ہیں ایسے ہیں راہنما لاکھوں

خود عقدہ جن کا حل نہ ہوا ایسے ہیں عقدہ کشا لاکھوں

لیکن تو عجز کا بندہ ہے جس بندے کے آقا لاکھوں

تیور تو دیکھ زمانے کے

ہر گھر میں ہوس کا ڈیرا ہے ہر دیں میں حرص پستی ہے  
 اقوام کے امن کی خود دشمن اقوام کی غالب پستی ہے  
 کیفیت امن کے شبدائی تو مائل کیف و مستی ہے  
 تیور تو دیکھ زمانے کے

نزدار کے پلے میں شہرت مفلس کا جہاں میں نام نہیں  
 کثرت ہے خداؤں کی اتنی بندے کا یہاں کچھ کام نہیں  
 مرنے کی دعا ہر لب پر ہے جینے کا کہیں پیغام نہیں  
 تیور تو دیکھ زمانے کے

اب وجہ فساد تجارت ہے اب امن کی فضا منہجنگ ہوئی  
 ناموس پہ مٹنے کی خواہش اس دور میں وجہ رنگ ہوئی

اللہ کے بندوں پر توبہ اللہ کی زمین بھی تنگ ہوئی

تو تو دیکھ زمانے کے

اب پند و نصائح سنتے ہیں ہم توپوں اور مشینوں سے

ہوتا ہے علاج درجہاں تلواروں سے سنگینوں سے

ہے اب تک لیکن ربط تجھے سجدوں سے اور جبینوں سے

تو تو دیکھ زمانے کے

جر کاٹ کے رکھ تقلید کی تو تو بھی دیکھ زمانے کے

بنیاد بھی رکھ تجدید کی تو تو بھی دیکھ زمانے کے

امید بھی رکھ تائید کی تو تو بھی دیکھ زمانے کے

تو تو دیکھ زمانے کے

# درویش کی دنیا

صدحیف کہ زنجیری بیداد جہاں ہے

آزاد روی ہو کہ ہو آزاد نگاہی

چل دہر میں اے مردِ خود آگاہ سنبھل کر

سو جرم کا اک جرم ہے ناکردہ گناہی

دل میں جو نہیں عزم تو کس کام کا وہ دل

خود تیری تباہی ہے ترے دل کی تباہی



دل چس کا پُرا نوار ہے انوارِ خودی سے

ہے اس کے لئے یسج مقدر کی سیاہی

سنّتے ہیں غلاموں کا خدا جاگ اٹھا ہے

ہے لرزہ بر اندام ہر اک مسندِ شاہی

درویش کی دُنیا ہے مساوات کی دُنیا

عسرت بھی امارت ہے فِقری بھی ہے شاہی

۱۹۴۰

# جب آدمی وحشی بن گیا

بستیوں کی بستیاں برباد و ویراں ہو گئیں  
 آدمی کی پستیاں آخر نمایاں ہو گئیں  
 قتل و غارت کے ہزاروں داغ لے کر وحشیت  
 آج سُنتے ہیں کہ پھر عصمت بداماں ہو گئیں  
 دیکھئے سرسبز کب ہوتی ہے کشتِ زندگی  
 آندھیاں کہتے تو ہیں ابر بہاراں ہو گئیں

یوں کبھی مذہب کی قدروں کو نہ انساں چھوڑتا  
 اے خوشا وہ خود بلائے جانِ انساں ہو گئیں  
 کون اب نیکی کرے انسانیت کے نام پر  
 نیکیاں تو جس قدر تھیں صرف ایماں ہو گئیں  
 جن خطاؤں پر درِ جنت ہوا آدم یہ بند  
 وہ خطائیں ہی بنائے بزمِ امکاں ہو گئیں

۱۹۵۰

# انقلاب

آستانِ دیوِ استبداد پر جھک نہیں سکتی جبینِ انقلاب  
 آسماں کے جور سے جوتنگ ہوں ان کا مامن ہے زمینِ انقلاب  
 ہے شہیدانِ وطن کی یاد میں خون سے تر آستینِ انقلاب  
 صاحبِ خرمین ہیں دنیا میں ہی جور ہے ہیں خوشہ چینِ انقلاب  
 جامِ زہر ابِ قدامت چھوڑ کر ہم پیس گے نگینِ انقلاب  
 ہے علاموں کا خداعزم بلند دینِ مظلوموں کا دینِ انقلاب

اے قدامت کیش تو بھی تو بدل

ہے اگر تجھ کو یقینِ انقلاب

۱۹۴۰



# جشن آزادی ۱۹۴۸

برق رفتاری پہ اپنی رشک کرتا تھا جہاں  
 سوئے آزادی ہمارا قافلہ تھا تیز گام  
 سیکھتا ہے لیکن اب میخانہ تعمیر میں  
 جنبش نبضِ تمنا و حرامِ دوجہام

منزلِ مقصود تک وہ قوم جا سکتی نہیں  
 جس کے قبضے میں نہیں اسپر سیاست کی لگام  
 ہم کو بچنا چاہیے ہر اس بُرے اقدام سے  
 جس سے ہو مطعون و دنیا میں وطن کا نیک نام  
 اتحاد و آشتی ہر دم رہیں پیشِ نظر  
 جاگزیں دل میں رہے فوقِ عمل بالائزہم  
 دورِ آزادی کا گوہرِ عیش ہے عیشِ حلال  
 دل یہ کہتا ہے کہ یوں پابند ہونا ہے حرام  
 دل کی تلقینات پر پہلے عمل فرمائیے  
 شوق سے پھر جشنِ آزادی مناتے جائیے

عیش کے سماں بھی ہوں اور فرض کا احساس بھی  
 جشن بھی ہو غم زدوں کی ناز برداری بھی ہو  
 داخلِ آدابِ مے نوشی ہو ساقی کا ادب  
 مستیاں ہوں مستیوں کے ساتھ ہشیاری بھی ہو  
 کچھ پیس اور کچھ چپائیس تشنہ کاموں کے لئے  
 سادگی کا ناز بھی، اندازِ پُر کاری بھی ہو  
 حال کی خاطر خسرو کوشتی ہے مستحقِ مگر  
 بہرِ استقبالِ جنوںِ ذوقِ بیداری بھی ہو  
 نرم رفتاری ہو وقتِ سیرِ گلزارِ طرب  
 راہِ پُر خارِ عمل میں گرم رفتاری بھی ہو

اس خوشی کے وقت کتنے دل ہیں غم سے پائمال  
 لطف آجائے اگر ان سب کی غم خواری بھی ہو  
 رونے والوں کی ہنسی کو پہلے واپس لائیے  
 شوق سے پھر حبشِ آزادی مناتے جائیے



## بازمانہ مسماز

حقیقتاً ہے فریبِ کمال خوش نظری

تیرے خیال کے فرضی بُتوں کی غشوہ گری

عجب نہیں کہ خسرو کا نقاب اُٹھ جائے

بروئے کار جو آئے جنوں کی پردہ دری

ہزار خونِ دل زار سے تو سینچ اسے

مگر یہ شاخِ تمنا بھی نہ ہوگی ہری

کبھی خیال بھی آیا ہے اے ہوس کے اسیر  
 کہ شکوہ سنج ہے تجھ سے دُعا کی بے اثری  
 حدِ جمال کو ٹھہرا دیا حیرمِ جلال  
 جہانِ ہوش کی شد سے یہ بے خبری  
 پڑے ہیں گوشِ برآواز ہم صغیر ترے  
 کہاں گیا ترا اندازِ نالہ سحری  
 نہیں قصور زمانے کی عیب چینی کا  
 نظر تری جو نہیں رمزدانِ خود نگری

بیا کہ سازِ جنوں را نوا طرازِ کنیم  
 نیازِ را بہ دلِ دردمند نازِ کنیم

کہاں وہ تاجِ فریدوں کہاں وہ محفل کے  
 نظامِ برسمِ عالم خسرو کا شاکی ہے  
 یہ پاشکِ تگی اضطرابِ انساں دیکھ  
 کہ آج تک نہ ہوا مرحلہ سکوں کا طے  
 مجھے یقین ہے ہوگی قبولِ گوشِ جہاں  
 جو سازِ دل سے نکل آئے انقلاب کی لے  
 کسی خسارِ زدہ کو سکوں نہیں دیتی  
 کچھ اور ہے یہ زمانے کی مے نہیں ہے مے  
 عجب نہیں ہے کہ دنیا کی آنکھ کھل جائے  
 نواطرِ از اگر ہو دلِ حسریں کی لے

کوئی مفسرِ حاضر تجھے بتا بھی سکا

زمانہ کہتا ہے تہذیب جس کو ہے کیا شے

یہ وقت ہے کہ زمانے پہ آشکار کریں

وہ رازِ خاص کہ حامل ہیں جس کے یہ رگ و پے

اماں پذیر نہ ماہی شدہ بہ کام نہنگ

سکوں نہ یافت جہاں از فساد و فتنہ و جنگ

چمن کے حق میں خرابی ہے ہستی گلچیں

کبوتروں کے لئے موت پنجہ شاہیں

بساطِ دہر کی شطرنج ہی نرالی ہے

پیادہ بن نہیں سکتا یہاں کبھی فرزیں



دئے یہ حضرتِ انساں نے زندگی کو فریب  
 نہ اس کو دولتِ دنیا ملی نہ دولتِ دیں  
 غم و الم کی جو پوچھو تو ہر جگہ موجود  
 مسرتوں کا کہیں بھی مگر سُراغ نہیں  
 زوالِ آدمِ خاکی تو دیکھ جھٹکتی ہے  
 حضورِ حضرتِ انساں ہی آدمی کی جبیں  
 وہ مُنتہائے تجسس وہ بارگاہِ سکون  
 چل آ کہ ڈھونڈ ہی لیں گے اسے کہیں نہ کہیں  
 نہیں فضا کوئی آلاستوں سے پاک یہاں  
 نہ مرگ و زلیلت کا عالم نہ آسماں نہ زیریں

بیا بہ غیرتِ عزمِ خودت بہ محفلِ ناز

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ مساز

۱۹۴۴

## دوسری جنگِ عظیم

جنگ کی ہے گرمی بازار کیا ہو گئے حالات کے آثار کیا

کہہ رہا تھا عرش پر روحِ الٰہیں ہو گئی مخلوقِ اشرف بھی لیں

جستجوئے عیش و راحت اک طرف شور و غوغائے ہلاکت اک طرف

تنگ ہے دنیا غریبوں کے لئے فاقہ مستوں بد نصیبوں کے لئے

ہے دماغِ قومِ انساں میں فتور کیوں انہیں تو نے بنایا ذی شعور

۱۹۴۰

## رشوت کا بازار

پٹواری کی خود رائی سارے ملک میں چلتی ہے

موٹی تو نند محصل کی بالائی سے پلتی ہے

نوٹ مٹھائی کی خاطر ریل کا بابولیتا ہے

بلی لے کر جو آئے فی بوری کچھ دیتا ہے

بھرتی اور کھدائی کے جھوٹے پل بن جاتے ہیں  
 سونا جان کے مٹی کو نہر کے بابو کھاتے ہیں  
 ٹھیکے دینے والوں کی ہر صورت سے چاندی ہے  
 عزت پر تو زور نہیں دولت ان کی باندی ہے  
 پھن پھیلائے پھرتے ہیں پیلے کانے ناگ ہیں یہ  
 دیش کی چھوٹی قسمت ہیں دیش کے اُٹے بھاگ ہیں یہ  
 رشوت خور زمانے میں روگ یہ ایسا پھیلا ہے  
 اُجلے کپڑے والوں کا اصل میں دامن مہیلا ہے  
 بھولے پن سے ہوتی ہیں باتیں ظاہر داری کی  
 پیسہ ان کا مذہب ہے شان ہے یہ عیاری کی



خدمت کا تو نام نہ لو فرض کا بھی احساس نہیں  
 سنکٹ میں ہو دیش تو ہو دیش کا ان کو پاس نہیں  
 تنخواہوں پر صبر نہیں بھتوں پر سنتوش نہیں  
 دکھیا روں کی خاک سُنیں ان کو اپنا ہوش نہیں  
 کوٹھی والے صاحب کی خود رائی کا کیا کہنا  
 اچھے اچھے ناموں کی رُسوائی کا کیا کہنا  
 کم ملتے ہیں ڈھونڈے سے بندے نیک کمائی کے  
 چہرے یوں تو رہتے ہیں ہر لب پر سچائی کے  
 لیڈر قسم کے لوگ بھی کچھ رشوت کے متوالے ہیں  
 جتنے اُجلے کپڑے ہیں اتنے ہی دل کالے ہیں

رُوکھی سُوکھی چھوڑ کے یہ سونا چاندی کھاتے ہیں  
 جھوٹ سے ان کے رشتے ہیں بدکاری سے ناتے ہیں  
 رشوت لینا جرم سہی رشوت دینا کیا کم ہے  
 وہ بھی قابلِ نفرت ہے یہ بھی قابلِ ماتم ہے  
 دھرم کی باتیں رہنے دو حسنِ عمل کا ذکر کرو  
 قوم کی عزت لٹتی ہے کچھ اس کی بھی فکر کرو  
 آزادی سے مطلب کیا جھوٹ اور پاپ کا دفتر تھا  
 یا پھر مجھ سے صاف کہو دُورِ غلامی بہتر تھا

# شہیدِ عظم

زمینِ ہند مقسرائی مچا کھرام عالم میں

کہا جس دم جو اہرلال نے "باپو نہیں ہسم میں"

فلک کا نیا ستاروں کی ضیا میں بھی کمی آئی

زمانہ رواٹھا دنیا کی آنکھوں میں نمی آئی

کمر ٹوٹی وطن والوں کی اہل دل کے دل ٹوٹے  
 ہوئے افسردہ باغِ نیکی و خوبی کے گل بوٹے  
 ہمیں کیا ہو گیا تھا ہائے یہ کیا ٹھکان لی ہسم نے  
 خلوص و آشتی کے دیوتا کی جان لی ہسم نے  
 جو دولت کٹ چکی افسوس اب واپس نہ آئے گی  
 ہزاروں سال رو کر بھی اسے دُنیا نہ پائے گی  
 یہ اچھی قوم ہے جو قوم کے سردار کو مارے  
 یہ اچھا دھرم ہے جو دھرم کے اوتار کو مارے  
 نگاہِ اہلِ عالم میں ملامت کا ہدف ہم ہیں  
 ہمیں نے قتل باپ کو کیا ہے نا خلف ہم ہیں



ہمیں ہیں مسلکِ محسن شناسی چھوڑنے والے

کنارے پر پہنچتے ہی سفینہ توڑنے والے

امیدِ قوم کی بنیاد تھی جس ایک بندے پر

غضب ہے گولیاں برسائیں ہم اُس نیک بندے پر

اکہلی جان اس کی بوجھ دنیا بھر کا سہتی تھی

مگر جو بات کہتا تھا وہ آخر ہو کے رہتی تھی

ہزاروں رستیں راہِ خدا میں مرنے والے پر

حسین ابن علی کی یاد تازہ کرنے والے پر

۱۹۴۸

## جیون دان

اُونچے پریت گہرے ساگر دیکھ کے ہیں حیران

اڑ سکتا ہے کتنا اُونچا

جا سکتا ہے کتنا گہرا

دُھن کا پکا بات کا سچا اک کُمزور انسان

جسم کا تھا کمزور مگر وہ من کا تھا بلوان

اس کی اُونچی شان

جگ میں اس کی اُونچی شان

اُتم اور مہسان

باپو اُتم اور مہسان

طوفانوں میں جس کے بل سے ہر مشکل آسان

سب کو ساہس دینے والا

دیش کی نیّا کھینے والا

ہاتھ میں لے پتوار اگر وہ کانپ اٹھیں طوفان

ویر بہا در یودھا جس کا کرے زمانہ مان

اس کی اُونچی شان

جگ میں اس کی اُونچی شان

اُتم اور ہسان

باپو اُتم اور ہسان

دیش پستانے کُٹی مرقی دیکھی جب شتان

در دھری آواز اُٹھائی

گمراہوں کو راہ دکھائی

اس پر بھی جب اُنت میں دیکھا خود اپنا ایمان



اپنے اک بیٹے کی گولی کھا کر دے دی جان

اس کی اونچی شان

جگ میں اس کی اونچی شان

اُتم اور ہسان

باپو اُتم اور ہسان

دھرتی ڈولی امبر ڈولا دیکھ کے یہ بلیدان

علیٰ حسین حسن کے پتھ پر

عیسے اور نلکن کے پتھ پر

جس پتھ پر سقراط نے چل کر رکھی اپنی آن

دیا اُسی پتہ پر باپو نے دیش کو جیون دان

اس کی اُونچی شان

جگ میں اس کی اُونچی شان

اُتم اور ہسان

باپو اُتم اور ہسان

۱۹۴۸

# خدا اور انسان

خدا:- وادی و کوہ و دمن میں نے تجھے بنختے ہیں

نہر و دریا و چمن میں نے تجھے بنختے ہیں

وقف تیرے لئے آسائش دُنیا کر دی

گلِ مقصود سے میں نے تیری جھولی بھری

انسان:- تیری دُنیا کو کیا ہے مُتمدّن میں نے

جو نہ ممکن تھا بنایا اُسے ممکن میں نے

میں وہ انساں ہوں تیری مرحمتِ محکم سے

نسلِ انساں کو مٹا سکتا ہوں اِٹمِ بزم سے

# نوائے عشق

نوائے عشق نہ کرتی اگر حُدی خوانی  
نہ کارواں نہ کوئی میرِ کارواں ہوتا  
(جوش)



محبّت سوز بھی ہے سار بھی ہے	خوشی بھی ہے یہ آواز بھی ہے
نیشمن کے لئے بے تاب طائر	وہاں پابندی پر آواز بھی ہے
مری خاموشی دل پر نہ جاؤ	کہ اس میں رُوح کی آواز بھی ہے
خوشی پر بھڑسا کرنے والے	خوشی درد کی غمّ ساز بھی ہے
ہے معراجِ خسرو بھی عرشِ عظم	جنوں کا فرش پا انداز بھی ہے
دل بیگانہ خود دنیا میں تیرا	کوئی ہمدم کوئی ہمارا بھی ہے
کبھی محتاج لے کا بھی نہیں یہ	کبھی نغمہ رہیں ساز بھی ہے
کبھی تو دل ہے مجھ بے نیازی	کبھی طوفِ حیم ناز بھی ہے
ترانہ ہائے سازِ زندگی میں	اک آوازِ شکست ساز بھی ہے

عشق کو محوِ ناز ہونے دے	حُسن سے بے نیاز ہونے دے
رکھ نہ درماں سے آسرا کوئی	درد کو چارہ ساز ہونے دے
آہ میں آہی جائے گی تاثیر	آہ کو دل گداز ہونے دے
ترکِ اُلفت کا آگیا الزام	اب تو افشائے راز ہونے دے
ہے تجھی پرستم تو پھر اُن کو	خوگر امتیاز ہونے دے
حُسن تو ہے ازل سے عشق طراز	عشق کو حُسن ساز ہونے دے

چھپ نہیں سکتے تجھ سے وہ اے عرش

دیدہٗ دل تو یازہ ہونے دے

۱۹۴۰

اب وہ کرتے ہیں مری غم خواریاں      ہو گئیں آسان سب دشواریاں  
 عرض واجب سے بھی رکھا بے نیاز      مجھ کو لے ڈوبیں مری خود داریاں  
 تم نے یہ کیا اپنے دل میں ٹھکان لی      کیوں ہیں میری اس قدر دل داریاں  
 ان سے ملتا ہے قناعت کا سبق      ایک نعمت ہیں مری ناداریاں  
 کوشش اظہارِ غم بھی ضبط بھی      آہ یہ مجبوریاں مختاریاں

عرش کیوں ہنستا ہے تو جھوٹی ہنسی

کس سے سیکھی ہیں یہ دنیا داریاں

۱۹۳۸

درو کا حال آہ سے پوچھو      دل کی باتیں نگاہ سے پوچھو

عظمتِ رحمتِ خداوندی	آرزوئے گناہ سے پوچھو
ان کی پیہم نوازشوں کا اثر	میرے حالِ تباہ سے پوچھو
وقتِ راحت کا کوئی ہے کہ نہیں	رنجِ شام و پگاہ سے پوچھو
کیوں ہے دنیا نظر میں تیرہ و تار	میرے بختِ سیاہ سے پوچھو
ماجرِ احتیاطِ اُلفت کا	پیشِ ہر نگاہ سے پوچھو
عقل کیوں ہے پناہ کی طالب	وحشتِ بے پناہ سے پوچھو
دلِ خوددار کی زبوں حالی	ہوسِ غم و جاہ سے پوچھو
پستی ہر بلندِ دنیا	منہائے نگاہ سے پوچھو

عرش پر کیوں دماغِ عرش اُڑا

ہفت کی واہ واہ سے پوچھو

۱۹۴۳



دل میں ہر وقت یاس رہتی ہے	اب طبیعت اُداس رہتی ہے
اُن سے ملنے کی گونہیں صورت	اُن سے ملنے کی آس رہتی ہے
موت سے کچھ نہیں خطر مجھ کو	وہ تو ہر وقت پاس رہتی ہے
اب حیاں جسے بھبھانہ سکے	زندگی کو وہ پیاس رہتی ہے
دل تو جلوں سے بدحواس ہی تھا	آنکھ بھی بدحواس رہتی ہے
ان کی صورت عجب ہے شعبہ باز	دور رہ کر بھی پاس رہتی ہے

دل کہاں عرش اب تو پہلو میں

ایک تصویرِ یاس رہتی ہے

۱۹۳۹

کچھ تو تہم پرست ہے شاید	خوہ پر شیخ مست ہے شاید
اعترافِ شکست ہے شاید	دل کا منزل پہ جا کے رُک جانا
دل حقیقت پرست ہے شاید	سجدۂ کفر سے نہیں ڈرتا
ہمتِ دل ہی پست ہے شاید	دل ہی جاتا دُعا کو بابِ قبول
زائدِ حق پرست ہے شاید	میکرے پر یہ کس نے دُشکامی
شوق ابھی تنگِ دست ہے شاید	ہے قناعت جو ایک جلوے پر
بُودِ ہمرنگِ بہت ہے شاید	اپنے ماضی کو حال سمجھا ہوں

عرشِ سُنا نہیں کسی کی بات

حال میں اپنے مست ہے شاید

۱۹۴۲

خوفِ پیری غمِ شباب نہیں	دل کی دنیا میں انقلاب نہیں
دیکھ لی ہر ماہ کی تنویر	تیرے رُخ کا کوئی جواب نہیں
اس کی تبیر پوچھنے والے	زندگی زندگی ہے خواب نہیں
اس سے بڑھ کر عتاب کیا ہوگا	اب مرے حال پر عتاب نہیں
حُسن کی خود نمائیاں تو بہ	بے نقابانی پہ بے نقاب نہیں
جو سمجھوں اسے کہ شانِ کرم	اب انہیں مجھ سے اجنباب نہیں
اللہ اللہ یہ جلوہ آرائی	اب انہیں فرصتِ حجاب نہیں
اس کی دنیا ہے سرسبز جلوہ	حُسن بھی عشق کا جواب نہیں
فطرتِ حُسن ہے حجاب پسند	حُسنِ فطرت تو بے حجاب نہیں

حُسن ہرگز نہیں سرور کا نام      حُسنِ مستی نہیں شبابِ نہیں

حُسن ہے قید و بند سے آزاد

رُوحِ معنی ہے یہ کتاب نہیں  
۱۹۴۰

خانہٴ دل میں داغِ جل نہ سکا      اس میں کوئی چراغِ جل نہ سکا

نہ ہوئے وہ شریکِ سوزِ نہاں      دل سے دل کا چراغِ جل نہ سکا

سوزِ الفت سے عقل ہے محفوظ      جل گیا دلِ داغِ جل نہ سکا

برق تھا اضطرابِ دل لیکن      آرزوؤں کا باغِ جل نہ سکا

دلِ مایوس میں اُمید کہاں      بجھ کے پھر یہ چراغِ جل نہ سکا

سردہری بھی ان کی رحمت تھی      سینہٴ داغِ داغِ جل نہ سکا



روشنی شعور بھی آئی پھر بھی دل کا چراغ جل نہ سکا

عرش کیا تجھ سے فیض محفل کو

تو مثالِ چراغِ جل نہ سکا

۱۹۴۲

دیکھ ساون کی یہ ہوا ساقی ابر آیا ہے تو بھی آ ساقی

مے کا پینا خطا ہی لیکن مے پلانا نہیں خطا ساقی

داد دے طرفِ مے کشتی کی مجھے خوب جی کھول کر پلا ساقی

تیری آنکھیں ہی کچھ کریں تو کریں میری قسمت کا فیصلہ ساقی

آہ تیرا تغافل جاں سوز آہ برسات کی ہوا ساقی

میں ترے دل کو آزمائوں گا تو مرا طرفِ آزما ساقی

وعظ سننے کو ہم نہیں آئے      کیا سزا اور کیا جزا ساقی  
 پینے والے خدا کے بندے ہیں      اور تو بھی ہے باخدا ساقی

ہاں رہے تیرا میکدہ آباد

ہے فقیروں کی یہ دُعا ساقی

۱۹۴۰

محبت میں کیا کیا جفاکاریاں ہیں      وفا داریاں بھی گنہگاریاں ہیں  
 مرے شوقِ الفت کا انعام دیکھو      وفاؤں کے بدلے جفاکاریاں ہیں  
 ہر اک دل مرتفع ہے مجبور یوں کا      کچھ ایسی محبت کی مختاریاں ہیں  
 محبت میں مرنا نہیں کوئی مشکل      وہ جینے میں ہیں جتنی دشواریاں ہیں  
 نرالی ہیں کیفیتیں اپنے دل کی      نہ بے ہوشیاں ہیں ہشیاریاں ہیں

کرامت ہے یہ یا ملوں ہے ان کا      تغافل میں نہیاں خبر داریاں ہیں  
 لگائی ہے کیا آگ دل میں کسی نے  
 ہر اک سانس کے ساتھ چنگاریاں ہیں

۱۹۳۷

اے وحشتِ دل شورِ خرد کیا	یتلخ و شیریں یہ تیک و بد کیا
ذکرِ ازل کیا فکرِ ابد کیا	اے عمرِ فانی اے عمرِ فانی
تو ڈھونڈ لے گا دنیا کی حد کیا	اے پاشکتہ اس جستجو سے
احساس پر یہ بارِ خرد کیا	کمزور راہی دشوار منزل
ہستی کا دعوے ہے ستر کیا	نظمِ جہاں کی اس برہمی سے
تجھ پر پڑی ہے تیری ہی زد کیا	جو تو نے بویا وہ تو ہی کاٹے

یہ بھی ہے دھوکا وہ بھی ہے باطل      فکر جنوں کیوں ذکرِ خسرو کیا  
جبریلِ نادم حیراں فرشتے      آخر کریں گے یہ دام و دد کیا

اے عرش ایسی باتوں سے حاصل

اپنوں سے اُلفت غیروں سے کد کیا

۱۹۴۱

خوش نصیب ملی اب خسرو کی حدِ محکو      زمانہ کہتا ہے بیگانہ خسرو مجھ کو  
حریفِ عقدہ کشائی ہے ہر ضافی بحث      نہیں پسند یہ تفسیرِ نیک و بد مجھ کو  
ازل کی بات جو تھی وہ ازل کیساتھ گئی      ہے گا اب تو ابد تک غمِ ابد مجھ کو  
جنوں کی آنکھ پہنچتی ہے ہر افق سے پر      حدِ نظر تو نہیں ہے نظر کی حد مجھ کو  
جنوں پسندِ طبیعت سکوں پذیر رہی      نہ اس آئی کبھی شورشِ خسرو مجھ کو



یہ اختلاف ہے اے عرشِ شانِ خود داری

زمانہ مجھ سے نفور اور اس سے کد مجھ کو

۱۹۴۴

بگڑی ہوئی قسمت کو بدلتے نہیں دیکھا	آجائے جو سرِ پُرا سے ملتے نہیں دیکھا
کیوں لوگ ہوا باندھتے ہیں تہمتِ دل کی	ہم نے تو اسے گر کے سنھلتے نہیں دیکھا
ہم جو رنج بھی سہہ لیں گے مگر ڈر ہے تو یہ ہے	ظالم کو بھی چھوڑتے پھلتے نہیں دیکھا
احباب کی یہ شانِ حریفانہ سلاست	دشمن کو بھی یوں نہرا گتے نہیں دیکھا
اشکوں میں سلگتی ہوئی اُمید کو دیکھو	پانی سے اگر گھر کوئی جلتے نہیں دیکھا
ہرم مردِ ہی کو جلاتی رہیں آپس	گھرِ غیر کا لیکن کبھی جلتے نہیں دیکھا
وہ راہ سُجھاتے ہیں ہمیں حضرتِ رہبر	جس راہ پہ ان کو بھی چلتے نہیں دیکھا

اُلفت میں اگر جان بکلی جائے تو سوچ ہے      دل سے مگر اراں نکلتے نہیں دیکھا  
 کیوں چاہئے والوں سے خفا آپ ہیں اتنے      پیرانوں سے یوں شمع کو جلتے نہیں دیکھا  
 ہر ایک علاجِ دل بے تاب ہے بے سُو      اس کو تو کسی طور پہلے نہیں دیکھا

اے عرشِ گنہ بھی ہیں ترے داد کے قابل

تجھ کو کفِ افسوس بھی ملتے نہیں دیکھا

۱۹۴۲

نیرنگی بہار و خزاں دیکھتے رہے      حیرت سے ہم طلسمِ جہاں دیکھتے رہے  
 ہم اُن کے ساتھ سیرِ جہاں دیکھتے رہے      کیا جانے دستِ ہم کو کہاں دیکھتے رہے  
 پیشِ نظرِ جہاں کے رہی حمتِ خدا      ہم بہیمی حُسنِ بتاں دیکھتے رہے  
 ہر گل ہماری عقل پہ ہستار ہا مگر      ہم فصلِ گل میں رنگِ خزاں دیکھتے رہے

عرضِ نیازِ شوق کی چھٹی ملی یہ داد      ہنس کر وہ میرا شکِ رواں دیکھتے رہے

طے کر گیا جنوں مرا اک حبست میں انہیں

حیرت سے مجھ کو کون بے مکان دیکھتے رہے

۱۹۴۱

مرا کارواں لٹ چکا ہے کبھی کا	زمانے کو ہے شوق ابھی ہزنی کا
دُورِ حسد کی عنایت کے صف	جنوں تیز ہوتا گیا زندگی کا
گرفتارِ تقلیدِ اجداد کہتے	بشر پر کھڑا از کب بندگی کا
تجسس کی اللہ کے حسنِ آفرینی	حجابات پر بھی گساں ہے اُسی کا
محبتِ تصوّرِ تصوّرِ محبت	نہ صورت کسی کی نہ جلو کسی کا
عجب چیز ہے آستانِ محبت	نہیں جس پہ مقبولِ سجد کسی کا

جو دیکھا تو حسرت جو سمجھا تو عبرت  
 بہت شور تھا عشرتِ زندگی کا  
 ستم سے بھی وہ ہاتھ اٹھانے لگے ہیں  
 نہرالا ہے انداز یہ برہمنی کا  
 بد و نیک سب ہیں اضافی گھر و بند  
 مکافات اک وہم ہے آدمی کا

عنایت ہے عرش ان جہاں پروں کی

مجھے ادعا ہے وفا پروری کا

۱۹۴۳

عشق کو تیری خوشی سمجھا تھا میں  
 رنج و غم کو بھی یہی سمجھا تھا میں  
 اک فریبِ آرزو ثابت ہوا  
 جس کو ذوقِ بندگی سمجھا تھا میں  
 موت سے بدتر نظر آئی مجھے  
 زندگی کو زندگی سمجھا تھا میں  
 اعتبارِ دوستی بے اصل ہے  
 اصل میں کچھ اور ہی سمجھا تھا میں



وہ محبت اک مصیبت بن گئی      جس کو اب تک دل لگی سمجھا تھا میں  
 احتیاط آموزِ دل نکلی یہی      دشمنی کو دشمنی سمجھا تھا میں

النفات اے عرش اُسی کا نام تھا

جس کو اُن کی بے رُخی سمجھا تھا میں

۱۹۴۳

عشق بُتاں کا لے کے سہارا کبھی کبھی

اپنے خُدا کو ہسم نے پکارا کبھی کبھی

آسودہ خاطر ہی ہی نہیں مطمح و فا

غصہ بھی کیا ہے ہسم نے گوارا کبھی کبھی

اس انتہائے ترکِ محبت کے باوجود  
 ہم نے لیا ہے نام ہمارا کبھی کبھی  
 طوفاں کا خوف ہے ابھی شاید کمرِ شہ کار  
 آتا ہے سامنے جو کسرا کبھی کبھی  
 بہکے تو میکرے میں مسازوں پہ آگے  
 یوں عاقبت کو ہم نے سنوارا کبھی کبھی  
 تنہا روی نے رکھی ہمارے جسوں کی لاج  
 گواہی کارواں نے چکا را کبھی کبھی  
 گو عشرتِ الم میں معاون تھی اُن کی یاد  
 ہم نے لیا مگر یہ سہارا کبھی کبھی

اب کیا کہیں دلِ مُستَوْن مزاج کو  
 اکثر یہ آپ کا ہے ہمارا کبھی کبھی  
 دل غرقِ عیش ہو کے ہوا لاکھ مطمئن  
 طوفانِ غم نے پھر بھی اُبھارا کبھی کبھی  
 پیہم ستم سے عشق کی تسکین ہونہ جائے  
 اے دوستِ التفاتِ خدا را کبھی کبھی  
 زاہد بھی چوم لیتا ہے پیرِ معناں کا ہاتھ  
 پا کر ترے کرم کا اثا را کبھی کبھی  
 فریادِ غم سے عرشِ سنبھلتا ہے دلِ مگر  
 لیتے ہیں اہلِ دل یہ سہارا کبھی کبھی

پہلو میں دل نہیں غمِ دوراں لئے ہوئے  
 قطرہ ہے جوشِ گرمی طوفاں لئے ہوئے  
 الزامِ پردہ دارئی ارماں لئے ہوئے  
 کب تک جسے کوئی غمِ نہاں لئے ہوئے  
 پہنچے ہیں اس مقام پہ اب اُن کے حیرتی  
 وہ خود کھڑے ہیں دیدۂ حیراں لئے ہوئے  
 بیتاب ہر کلی ہے ہر اک پھول مضطرب  
 آجائے چمن میں بہاراں لئے ہوئے



موقوفِ حُسنِ گل ہی نہیں رونقِ بہار  
 بیٹھے ہیں ہنس بھی چاکِ گریباں لئے ہوئے  
 صبحِ ازل اُٹھا تھا کوئی گوشہٴ نقاب  
 اب تک ہے آنکھ دید کا ارماں لئے ہوئے  
 اک دردے کے آئی ہے دل میں تمہاری یاد  
 آجساؤ تم بھی درد کا دریاں لئے ہوئے  
 آتا ہے میکرے کی طرف کون دیکھتا  
 ماتھے پہ داغِ سجدۂ ایماں لئے ہوئے  
 آئے ہیں ہر قسم پہ وہ جلوے بکھیرتے  
 ہر اک ادا میں حُسن کا طوفاں لئے ہوئے

ہنگامہ حسرت میں پھراٹھا جنوں کا جوش  
 تسکینِ قلب و روح کا سماں لئے ہوئے  
 مصروفِ شرحِ غم ہے ہر اک اہلِ انجمن  
 بیٹھا ہے عرش ہی غم پہنساں لئے ہوئے  
 ۱۹۴۴

تیرا کرم نہ ہو تو فغاں میں اثر کہاں  
 بے انتفاعِ خاص غمِ معتبر کہاں  
 عزت کہاں وطن کے وہ شام و سحر کہاں  
 وہ لطفِ کوئے دوست وہ دیوار و در کہاں

وہ اہتمامِ راحتِ قلب و جگر کہاں  
 پہلی سی وہ ہتھاری کرم کی نظر کہاں  
 بے تابیاں بجا مرے ذوقِ سحر و کی  
 لیکن اس آستانے کے لائق یہ سر کہاں  
 اُن کا کرم ہوا تو گئیں غم کی عشرتیں  
 اے دوست اب وہ لذتِ آہِ سحر کہاں  
 ہم کو قفس سے حکم رہائی تو مل گیا  
 اڑنے کے واسطے ہیں مگر بال و پر کہاں  
 رہبر تو کیا نشاں کسی رہزن کا بھی نہیں  
 گم گشتگی گئی ہے مجھے چھوڑ کر کہاں

دل بستگی کا کوئی بھی ساماں یہاں نہیں  
 ویرانہ جہاں میں بناؤں میں گھر کہاں  
 دُنیا میں اور اس کا ٹھکانا کہیں نہیں  
 جائے غمِ فراق مجھے چھوڑ کر کہاں  
 چشمِ طلب کے واسطے آساں ہے سیرِ عرش  
 فرصتِ خیالِ دوست میں اتنی مگر کہاں  
 ۱۹۴۵

جس غم سے دل کو راحت ہو اُس غم کا مداوا کیا معنی  
 جب فطرت طوفانی ٹھہری ساحل کی تمنا کیا معنی



عشرت میں رنج کی آمیزش راحت میں الم کی آلائش  
 جب دُنیا ایسی دُنیا ہے پھر دُنیا دُنیا کیا معنی  
 خود شیخ و برہمن مجرم ہیں اک جام سے دونوں پی نہ سکے  
 ساقی کی نخل پسندی پر ساقی کا شکوہ کیا معنی  
 جلووں کا تو یہ دستور نہیں پردوں سے کبھی ہائیں  
 لے دیدہ بے توفیق ترا یہ ذوق تماشا کیا معنی  
 اخلاص و وفا کے سجدوں کی جس درپردہ نہیں ملتی  
 لے غیرتِ دل اے عزمِ خودی اس درپر سجد کیا معنی  
 لے صاحبِ نقد و نظر مانا انسان کا نظام نہیں اچھا  
 اُس کی اصلاح کے پردے میں اللہ سے جھگڑا کیا معنی

ہر لحظہ فزوں ہو جو شِ عمل یہ فرض ہے فرض کی لہ چل  
 تدبیر کا یہ رونا کیسا تقدیر کا شکوہ کیا معنی  
 مینخانے میں تو اے واعظِ تلقین کے کچھ اسلوب بدل  
 اللہ کا بندہ بننے کو جنت کا سہارا کیا معنی  
 اظہارِ وفا لازم ہی سہی اے عرشِ مگر فریادیں کیوں  
 وہ بات جو سب پر ظاہر ہے اُس بات کا چرچا کیا معنی

۱۹۴۳

محبت بگاڑے محبت ستوارے

نہ تم ہم سے جیتے نہ ہم تم سے ہائے

نہ آنے دیا راہ پر رہسبروں نے  
 کئے لاکھ منزل نے ہم کو اشارے  
 ہم آغوشِ طوفاں تو ہونا ہے اک دن  
 سنبھل کر چلیں کیوں کنارے کنارے  
 انہیں کر گئی پار ہر کشتی نو  
 بہت زور پر تھے قدامت کے دھارے  
 یہ انساں کی بے چارگی ہائے توبہ  
 دعاؤں کے باقی ہیں اب تک سہارے  
 وہ ہے بزمِ دارائی ابنِ آدم  
 فرشتہ بھی آکر جہاں دم نہ مارے

غنیمت ہے یہ ما حاصل زندگی کا  
 دے دے لہ جائے، غمے غمگسارے  
 نہ مجنون و لیلے نہ فرہاد و شیریں  
 فسانے ہیں یہ سب ہمارے تمہارے  
 یہ اک شجرہ ہے کہ ہے موجِ دل کی  
 کسی کو ڈبوئے کسی کو اُٹھارے  
 وہ جانِ چمن ہی نہیں عرشِ ورنہ  
 بہت لطف دیتے چمن کے نظارے

۱۹۵۰



یہ کون آیا رہزن کی طرح جو دل کی بستی ٹوٹ گیا  
 آرام کا دامن چاک ہوا تسکین کا رشتہ ٹوٹ گیا  
 کہتا ہے فراہم کیوں ناداں ٹکڑے دل کے آئینے کے  
 اب جوڑ کے اس کو کیا لے گا جو ٹوٹ گیا وہ ٹوٹ گیا  
 ہم جس کو دکھا کر دنیا سے کچھ دادِ محبت پالیتے  
 افسوس کہ غم کی چوٹوں سے وہ دل کا چھالا پھوٹ گیا  
 دامن میں لئے پھرتی تھی جسے محتاط خسر کی نادانی  
 ان مصلحتوں کی دولت کو عشق ایک نظر میں ٹوٹ گیا

بیچارگی دل کے صدقے احساسِ غمِ اُلفت بھی نہیں  
 یہ ایک سہارا تھا اپنا اب یہ بھی سہارا چھوٹ گیا  
 اے راہنما تو بیٹھ یہیں ہم خود منزل کو جا لیں گے  
 دو چار قدم چل کر ہی تیرا دم ٹوٹ گیا جی چھوٹ گیا  
 اے عرش و فورِ گریہ میں یہ حسنِ تصوّر لا حاصل  
 جلوں کو پر و تے تھے جس میں وہ تارِ نظریں ٹوٹ گیا  
 ۱۹۴۱

ساقی تری صحبت میں کیا عالمِ مستی ہے  
 جنتِ مری نظروں میں اُجڑی ہوئی بستی ہے

کیوں جام کو مینا سے یوں دُور کیا تو نے  
 محفل تو ابھی ساقی پینے کو ترستی ہے  
 میخانہ ہستی میں یہ جوڑ نہ ٹوٹے گا  
 مستی ہے تو رندی ہے رندی ہے تو مستی ہے  
 پھر فصل بہاراں میں آباد ہوئے گلشن  
 میرے دل ویراں پر حسرت ہی برستی ہے  
 کیا اوج دیا مجھ کو اس حُسنِ تخلص نے  
 اے عرش مری دُنیا بیگانہ پستی ہے

۱۹۴۳

یہ سچ ہے ضبط میں جی کو ڈبویا بھی نہیں جاتا  
 مگر اب تو یہ عالم ہے کہ رویا بھی نہیں جاتا  
 خوشی آئے تو غم کو بھول جانا ہی مناسب ہے  
 مگر غم کو مسرت میں سمویا بھی نہیں جاتا  
 دل خود دار و امانِ وفا پر داغ ہے بے شک  
 مگر یہ داغ ایسا ہے کہ دھویا بھی نہیں جاتا  
 تمہارے منتشر جلووں سے کیا تسکین ہو مجھ کو  
 نظر کے تار میں ان کو پرویا بھی نہیں جاتا



اگر ساحل نہیں ملتا تو یہ کم ہمتی کیسی  
 بھنور میں کیا سفینے کو ڈبوایا بھی نہیں جاتا  
 یہ کیا شانِ تقابل ہے کہ تم تو خندہ بر لب ہو  
 تمہارے چاہنے والوں سے رویا بھی نہیں جاتا  
 اُسے کھو کر نشاطِ جستجو سے بہرہ ور ہوتے  
 مگر وہ دل نشیں اے عرش کھویا بھی نہیں جاتا

۱۹۴۵

اگر تقدیر تیری باعثِ آزار ہو جائے  
 تجھے لازم ہے اس سے برسرِ پیکار ہو جائے

مری کشتی ہے، میں ہوں اور گردابِ محبت ہے  
 جو تو ہونا خدا میرا تو بیڑا پار ہو جائے  
 کمالِ ضبطِ غم سے یہ گوارا ہی نہیں مجھ کو  
 کہ حرفِ آرزو شرمندہ اظہار ہو جائے  
 ترے خوابِ گراں پر اے دلِ نادان تعجب ہے  
 کہ تو سوتا رہے سارا جہاں بیدار ہو جائے  
 انہیں کیوں کوستا ہے جو تجھے کہتے ہیں کم ہمت  
 بُرا کیا ہے حقیقت کا اگر اظہار ہو جائے  
 تمہیں اے عرش کیوں ہے تیرِ غم سے اتنی بے زاری  
 یہی بہتر ہے یہ ناوکِ جگر کے پار ہو جائے

یوں تو کہنے کو لبشر بیٹا بھی ہے دانا بھی ہے  
 کیا کوئی اس سے بڑا دُشیا میں دیوانا بھی ہے  
 سُمر بھی ہے اک تال بھی اک سُم بھی اک گانا بھی ہے  
 زندگی عنوانِ افسانہ بھی افسانا بھی ہے  
 تجھ کو اے دل خود تر پ کر اُن کو تر پانا بھی ہے  
 ناز سہنا ہی نہیں ہے ناز و فر مانا بھی ہے  
 آرزو کا حاصل کھونا بھی ہے پانا بھی ہے  
 یہ تلون کیشِ دل بستی بھی ویرانا بھی ہے

تو نے سوچا بھی کبھی ہے اے دلِ منزل طراز  
 ایک منزل قیدِ منزل سے نکل جانا بھی ہے  
 مطمئن ہے کیوں رہائی پر روایت کے اسیر  
 پھاندِ کمر دیوارِ زنداں کو اسے ڈھانا بھی ہے  
 پھر کوئی پُر سوز نعرہ عصرِ حاضر کے نقیب  
 گرم ہو کر آج اہلِ دل کو گہ مانا بھی ہے  
 معرفتِ ہم کو نہ رازِ حسنِ پُرفتن کی ہوئی  
 گویہ فیضِ عشقِ کچھ سمجھا بھی ہے جانا بھی ہے  
 عقل والے تو اٹھا سکتے نہیں بارِ جنوں  
 کیا کوئی اے اہلِ محفل تم میں دیوانا بھی ہے



عشرتِ منزل رسی اے عرشِ لازم ہی سہی  
گرمیِ ذوقِ سفر سے دل کو گرمانا بھی ہے  
۱۹۴۹

بیاں ہوں بھی تو ہوں آخر کہاں جو دل کی باتیں ہیں  
نہ تنہائی کی باتیں ہیں نہ یہ محفل کی باتیں ہیں  
مرتب کر لیا یوں ہم نے افسانہ محبت کا  
کچھ اُن کے دل کی باتیں ہیں کچھ اپنے دل کی باتیں ہیں  
جو ان میں بھنس گیا پھر راہ پر وہ آہنیں سکتا  
بڑے چکر کی باتیں رہیں منزل کی باتیں ہیں

تمہارا وعظ رازِ عشق کیا کھولے گا اے واعظ  
 زباں کی یہ نہیں حضرت یہ چشم و دل کی باتیں ہیں  
 وہ محفل سے جدا بھی ہو چکے محفل کو گرما کر  
 مگر محفل میں اب تک گرمی محفل کی باتیں ہیں  
 زباں سے کچھ کہو صاحب مگر معلوم ہے ہم کو  
 تمہارے دل کی سب باتیں ہمارے دل کی باتیں ہیں  
 مجھے درس سکوں دیتے ہیں وہ جوشِ تنائیں  
 ادھر طوفان کی خواہش ادھر ساحل کی باتیں ہیں  
 میں اپنے حال و ماضی پر بھی کچھ اے عرشِ رولیتا  
 مگر پیشِ نظر اس وقت مستقبل کی باتیں ہیں

احساسِ حُسن بن کے نظر میں سما گئے  
 گو لاکھ دُور تھے وہ مگر پاس آ گئے  
 اک روشنی سی دل میں تھی وہ بھی نہیں رہی  
 وہ کیا گئے چراغِ تمنا بجھا گئے  
 دیر و حرم سے اور تو حاصل نہ کچھ ہوا  
 سجدے غم و رنجِ عشق کی قیمت گھٹا گئے  
 تہناروی میں یوں تو مصیبت تھا ہر قدم  
 ہم اہلِ کارواں سے تو بیچھا چھڑا گئے

کتنا فریب کار ہے احساسِ بندگی  
 ہم منزلِ خودی سے بہت دُور آگئے  
 اُلفت میں فکرِ زلیبتِ ندامت کی بات بھی  
 اچھے رہے جو جان کی بازی لگا گئے  
 جو حال اُن کا تھا وہ ہمیں جانتے ہیں عرش  
 یوں وہ ہماری بات ہنسی میں اُڑا گئے  
 ۱۹۴۵

وفا پر مٹنے والے جان کی پروا نہیں کرتے  
 وہ اس بازار میں سود و زیاں دیکھا نہیں کرتے



جنہیں گم گشتگی کے فیض سے ہے ہر قدم منزل  
 جنوں شوق میں رہبر کی وہ پروا نہیں کرتے  
 جنہیں خود اعتمادی مائل تدبیر رکھتی ہے  
 وہ ناکامی میں بھی تقدیر کو رویا نہیں کرتے  
 نہیں جھکتی نگاہ شوق پستی کی طرف اپنی  
 ہم اپنے ذوقِ نظارہ کو یوں رسوا نہیں کرتے  
 ارے جن کے طوفانی ہیں فطرت جن کی طوفانی  
 وہ کشتی کو کنارے کی طرف پھیرا نہیں کرتے  
 خلوص عشق میں خود مطلبی کیسی، ریا کیسی  
 ہم ان داغوں سے دامنِ وفا پیدا نہیں کرتے

جنہیں اعمال پر خفّت گناہوں پر زحمت ہے

کسی کے عیب کا دنیا میں وہ چرچا نہیں کرتے

جنہیں اے عرش حق نے دی ہے توفیقِ اوالعزمی

وہ گردابِ حوادث میں الجھی ڈوبا نہیں کرتے

۱۹۳۲

دل ہوتا ہے تسکین کے عالم میں حزیں اور

لے چل مجھے اے شوقِ سبک گام کہیں اور

ہاں اور اٹھا پردے کو اے پردہ نشیں او

مجھ سا نہیں کوئی ترے جلو و گل ایس اور

جتنی وہ مرے حال پہ کرتے ہیں جفا ئیں  
 آتا ہے مجھے اُن کی محبت کا لیتیں اور  
 مے خانے کی ہے شان اسی شورِ طلب سے  
 ہر اور نہیں پر ہے تقاضا کہ نہیں اور  
 ہے حاصلِ صدرِ لیست جوانی کا یہ عالم  
 اے عمرِ گریزاں مجھے رہنے دے یہیں اور  
 مجھ سا جو نہیں اور کوئی چاہنے والا  
 تجھ سا بھی زمانے میں نہیں کوئی حسیں اور  
 کافی نہیں مجھ کو یہ نگاہِ غلط انداز  
 ہاں اور بڑھا حوصلہٴ قلبِ حسدیں اور

تکرار کا اے شیخ یہی تو ہے نتیجہ

تم نے جو کہیں اور تو ہم سے بھی سُنین اولہ

ہم مرتبہ عرش کوئی ان میں نہ ہوگا

ہوں گے درِ جاناں کے بہت خاک نشین اولہ

۱۹۴۳

یوں بھی فریبِ ذوقِ طلب کھا رہا ہوں میں

تیرا نشان پا کے مٹا جا رہا ہوں میں

صد گونہ رشک ہے مجھے اپنے نصیب پر

دُنیا کو کھو رہا ہوں تجھے پا رہا ہوں میں



جو سو سے تھے دل میں وہ اب ہو رہے ہیں دُور  
 شاید ترے قریب ہوا جا رہا ہوں میں  
 وِٹیا کو رشک ہے مری فکرِ بلند پر  
 مجھ کو خبر نہیں کہ اڑا جا رہا ہوں میں  
 لیتا ہوں اپنا نام کبھی نامِ غیر کا  
 یوں بات بات میں اُنہیں اُلجھا رہا ہوں میں  
 آئے گا کب یقین تمہیں میری بات کا  
 مانو بھی اب تمہاری قسم کھا رہا ہوں میں  
 رہ کر اسیرِ طاقتِ پرواز بنتی کہاں  
 حیرت ہے کن پروں سے اڑا جا رہا ہوں میں

حسرتِ فنا ہے میرے مصائب کی داستاں  
 دل کو ترے خیال سے بہلا رہا ہوں میں  
 ہر منظرِ بلند بھی اب پست ہو چکا  
 اے عرشِ کس فضا میں اڑا جا رہا ہوں میں  
 ۱۹۳۷

کسی نغمے میں ہے وہ اور نہ کسی ساز میں ہے  
 رس بھری نغمہ سی لئے جو تری آواز میں ہے  
 گوشِ مشتاق کی خود ساختہ تفسیق ہے یہ  
 ورنہ جو ساز سے باہر ہے وہی ساز میں ہے

لے نہ ڈوبے کہیں خوش فہمی ادراک تجھے  
 ناخدا کی تری پوشیدہ اسی راز میں ہے  
 آپ ہی زندہ کریں مردہ تمناؤں کو  
 قسم باذنی کا اثر آپ کی آواز میں ہے  
 ہم مصیروں کی نواؤں کا اثر ہے شاید  
 ہر گرفتارِ نفس کو شش پر واز میں ہے  
 کیوں کریں غیر سے ہم عرضِ نیازِ اُلفت  
 جس کے طالب ہیں ابھی جلوہ گہِ ناز میں ہے  
 عرش تک دیکھئے پہنچے کہ نہ پہنچے کوئی  
 آہ کے ساتھ دُعا بھی مری پر واز میں ہے

# واردات

زکونے یارمی آید نسیم بادِ نوروزے  
ازیں بادار مددخواہی چراغِ دل پر فروزے  
(حافظ)



# آمدِ شباب

روح کہتی ہے کہ اُمٹھ جامِ مُسرت پی لے

دلو لے کہتے ہیں دور روز تو ہنس کر جی لے

انکھ کہتی ہے ضرورت نہیں اشکِ غم کی

دیکھ وہ آئی گھٹا اور وہ جلی چکی

دل یہ کہتا ہے کہ جذبات کو بیدار تو کر

عشق کو حُسن کے رازوں سے خبردار تو کر

انگلیاں کہتی ہیں لا ساز طرب خیز کوئی

لب یہ کہتے ہیں کہ دے ساغیر لبریز کوئی

درو کہتا ہے مجھے پاس نہ آنے دے کبھی

دل پہ کلفت کی گٹھائیوں کو نہ چھانے دے کبھی

شوق کہتا ہے دل جاں پہ مجھے چھانے دے

اپنے گلزارِ محبت میں بہار آنے دے

بُخ پر سُرخ تو طبیعت میں روانی آئی

مُردہ اے جوشِ تمنا کہ جوانی آئی

۱۹۳۰

## کلفٹن<sup>۱</sup>

(۱) کراچی کی ایک تفریح گاہ جو سمندر کنارے واقع ہے (

شام کو کراچی کے مرد و زن یہاں تفریح کے لئے پہنچتے ہیں اور سمندر کی  
اُٹھتی ہوئی لہروں میں نہاتے ہیں۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں یہ منظر دیکھا اس کی  
یاد دل میں باقی رہی۔ جولائی ۱۹۴۰ء میں یہ منظم بھی گئی :-

اک کیف کا عالم تھا سمندر کے کنارے

دیکھے جو کراچی میں کلفٹن کے نظارے

اُمٹھتی ہوئی بہروں میں شفق عکس فگن تھی

جیسے کہ ہوں پانی سے ہم آغوش تھراے

نکھری ہوئی وہ شام وہ تزیین مناظر

وہ موج میں آئے ہوئے بہتے ہوئے دھارے

گل پوش حسینوں کا وہ سیلاب کہ توبہ

مہ پاروں کے جھگھٹ وہ سمندر کے کناے

موجوں کے تلاطم میں وہ ڈر ڈر کے سنبھلنا

چلنا وہ حسینوں کا حسینوں کے سہارے

امواج کے پردے میں وہ اک آنکھ مچولی

بہروں کے حسینوں سے اشاروں پہ اشارے



اک قص کے عالم میں تھے کس بھی مُسن بھی  
 یا چو کڑی بھرتے تھے ہرن اور چکارے  
 وہ چومنا اڑاڑ کے بدن سیم تنوں کے  
 پانی کی چھینٹیں تھیں کہ سیماب کے پائے  
 اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی نوخیز جوانی  
 میرے دل افسردہ پہ چلتے ہوئے آئے  
 اس کیف کی دُنیا میں بھی بے کیف رہا میں  
 جیتا ہوا پا لای بھی نہ ایسے کوئی ہمارے  
 پھر پردہ غم چھیڑ گئے بربطِ دل کا  
 لمحات جو دو چار کلفٹن پہ گزارے

طاری ہوا ہر سمت فضاؤں پہ دھند لکا  
 لوٹا تو یہ کہتے تھے چمکتے ہوئے تارے  
 جنت میں بھی رہتا ہے جو آلودہ غم تو  
 آیا تھا یہاں کس لئے تقدیر کے مارے  
 دل سنس دیا اک کافرہ کی یاد میں رو کر  
 جب وہ نہیں جذبات کو پھر کون ابھارے

# میں کیوں بھول جاؤں

تیری چشمِ میگوں کا بریز سا غر      جوانی تیری کیف آور جوانی  
 گلستاں در آغوشِ حسنِ تبسم      وہ تیرے لبِ سُرخ کی گلِ فستانی  
 تکلم کے اندازِ خاموشیوں میں      زبانِ نظریہ چیا کی بہانی  
 تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

وہ سانسوں کی تیری وہ سینے کی ٹھکر      وہ دونوں کا چھپ چھپ کے آنسو بہانا  
 وہ تجدیدِ الفت کے سو سو بہانے      وہ اک دوسرے سے یوں نہیں روٹھ آنا

وہ ترکِ محبت کے الزام دے کر  
کسی کا کسی کو ہنسی میں رُلانا

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

وہ پاسِ ادب و خلوصِ محبت  
و فوری تمّت میں خاموش رہنا

وہ نظارگی میں تحیر کا عالم  
خود اپنی نگاہوں سے روپوش رہنا

رضا جو طبیعت وہ تسلیم کیشی  
غم و رنج میں بھی وفا کوش رہنا

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

سوالوں کا طومار مبہم زباں میں  
مگر رازِ دل کا نہ اظہار کرنا

نگاہیں ملانے میں تو اک جھجک سی  
مگر دل ہی دل میں مجھے پیار کرنا

وہ عرضِ محبت میں معصوم وعدے  
وہ لکنتِ زباں کی وہ اقرار کرنا

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں



تری چشم پرِ نغم وہ مسعودِ ساعت  
یقین بن گیا جب گمانِ محبت

محبت کے دن او و فرقت کی لہریں  
دُعائیں تھیں جب ترجمانِ محبت

وہ خطِ جن کا ہر لفظ اک داستان تھا  
وہ جذبات سے پر بیانِ محبت

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

وہ چٹکی ہوئی چاندنی کی بہاریں  
وہ گلپوشِ راتیں وہ دلکش نظارے

مناظرِ سمٹتے ہوئے آبِ جو میں  
فلک پر چمپکتے ہوئے چاند مائے

وہ تھک کر کسی کا یو نہیں بیٹھ جانا  
وہ اٹھنا کسی کا کسی کے سہارے

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

وہ طوفانِ جذبات وہ زورِ تمنا  
وہ جوشِ محبت وہ پرِ شوقِ باتیں

وہ گھڑیاں وہ آرامِ راحت کی گھڑیاں  
وہ فرصت کے دنِ مسرت کی راتیں

وہ گھانیں وہ گھاتوں کے پرے میں وعدے  
وہ وعدے وہ وعدوں پر دیں گھاتیں

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

مالِ مسرت وہ مجبور آنسو  
وہ کیفِ طرب کا غم انجام ہونا

پُر الزام باتیں وہ سب کی زباں پر  
محبت کے قصے کا وہ عام ہونا

وہ برگشتہ خاطر بزرگوں کی باتیں  
وہ معصوم رُوحوں کا بدنام ہونا

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

وہ ناگاہِ فرقت پہ مجبور ہونا  
فریبِ تقدّر کی وہ چیرہ دستی

خمارِ مئے عیش اور نامرادی  
وہ مرگِ تمنا وہ انجامِ مستی

رسومِ کہن کی ستم آفرینی  
زمانے کا جورِ قدامت پرستی

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

# کل رات سے

کس قدر ہے اُن سے ملنے کی خوشی کل رات سے

زندگی میں آگئی ہے تازگی کل رات سے

وعدہ فرمایا مجھ کو آ رہا ہے اعتبار

ہو رہی ہے دُور و ل کی بے کلی کل رات سے

میں فراہم کر رہا ہوں عیش کا سامان اب

ہو چکی ہے ختم غم کی زندگی کل رات سے

دل میں جو شکوے تھے وہ اب ہیں پُنی داستان  
 بس گئی ہے دل میں اک دنیا نئی کل رات سے  
 اک تبسم کی ادا نے مجھ پہ جادو کر دیا  
 ہو گئی ہے دُور دل کی برہمی کل رات سے  
 اس تغیر کے لئے اُن کو دعا دیتا ہوں میں  
 موت بھٹی کل رات تک ہے زندگی کل رات سے  
 ہو رہا ہے مہرباں مجھ پر وہ رشکِ صدفِ بہار  
 کھل رہی ہے پھر مرے دل کی کلی کل رات سے  
 اُن کا جلوہ خواب میں پُر کیف مجھ کو کر گیا  
 آنکھ میں آئی ہوئی ہے نیند سی کل رات سے



عالم وحشت تھا طاری ہر طرف کل رات تک

ہر درو دیوار میں ہے دل کشی کل رات سے

بن گیا ہے دل کا ہر ارمان اک بزم نشاط

نغمہ زن ہے عرش ساز زندگی کل رات سے

۱۹۳۹

تبسمِ دل نواز تر آنکلمِ دل نشیں سے بہتر

گمان تری عنایتوں کا عنایتوں کے یقیں سے بہتر

نشاط پر وہ ہے چشمِ مے گون تبسمِ لب سے بھی زیادہ

کہ تلخی مے ہے مے کشوں کو حلاوتِ انگلیں سے بہتر

## دورِ عیش

فرمانِ مست ہوا پھر دہریہ جاری  
پھر راتِ عشر ہوئے ہر روح میں ساری

پھر صحنِ گلستاں میں چلی بادِ بہاری  
پھر بلبلِ شوریدہ کے گانے کے دن آئے

صدِ شکر کہ پھر عیش منانے کے دن آئے

صدِ شکر کہ ہیں کیف سے معمورِ فضا ہیں  
صدِ شکر کہ پھر چھائی ہیں گلشن پہ ٹھائیں

صدِ شکر کہ پھر دُور ہیں توبہ کی بلا ہیں  
صدِ شکر کہ پینے کے پلانے کے دن آئے

صدِ شکر کہ پھر عیش منانے کے دن آئے

ہر شاخ پہ ہیں پھول پھولوں پہ بسم  
ہر زین میں نغمے ہیں تو نغموں میں ترنم  
اللہ سے دیا ہے مسرت کا تلاطم  
ہر موج کے پھر موج میں آنے کے دن آئے

صد کہہ کہ پھر عیش منانے کے دن آئے

قد کا نیا ڈھنگ ہے فطرت کا نیا طو  
کل اوتھارنگ آج زمانے کا ہے رنگ او  
جس دور میں رہا ہے وہ ہے وہ دو  
پھر سرخوش و مسرت بنانے کے دن آئے

صد کہہ کہ پھر عیش منانے کے دن آئے

گھلنے کو ہے الطاف و محبت کا خزانہ  
ہے عرش کے لب پر بھی مسرت کا ترانہ  
آیا ہے امیدوں کے بر آنے کا زمانہ  
بگڑی ہوئی تقدیر بنانے کے دن آئے

صد کہہ کہ پھر عیش منانے کے دن آئے

# سوز و گداز

چون غم تو نتوان یافت مگر در دلِ شاد

ما به اُمیدِ رحمتِ خاطرِ شادِ طلسم

(حافظ)



# بیوہ کی فریاد

بے عطف و اضافت

کسی کی یاد دل میں ہے کہ جس سے جی نڈھال ہے

کہوں اگر تو کیا کہوں عجب طرح کا حال ہے

نہ وہ زمیں نہ وہ فلک نہ اب وہ کائنات ہے

وہ زندگی ہی اب نہیں نہ دن ہے وہ نہ رات ہے

وہ آرزو ہے کونسی جو آج پا بہ گل نہیں

ہے نامِ دل کا دل مگر جو سچ کہوں تو دل نہیں

گھٹا اُٹھی تو ہے مگر پیپا آج گائے کیا  
 ترپ مری مٹائے کیا لگی مری بھجائے کیا  
 وہ پریم سے بھرے چین کہ جن سے کان آشنا  
 وہ مست آنکھ مد بھری کہ جس سے جان آشنا  
 وہ بات بات پر سنسی وہ چھڑ پیار پیار میں  
 قرار اک ترپ میں وہ ترپ وہ اک قرار میں  
 بکھی ادھر سے تا کنا بکھی ادھر سے دیکھنا  
 وہ میرے دل کے شوق کو مری نظر سے دیکھنا  
 غرض وہ دن کہ جب مرے چین میں اک بہار تھی  
 غرض وہ دن کہ جب خوشی مرے لئے سنگار تھی

غرض وہ دن کہ نعمہ زن سرتوں کا ساز تھا

غرض وہ دن کہ حُسن جب مرا نظر نواز تھا

غرض وہ دن کہ دل سے جب نشانِ غم کا دُور تھا

غرض وہ دن کہ آنکھ میں بھرا ہوا سرور تھا

غرض وہ دن کہ میں بھی جب کسی کے دل کا ناز تھی

غرض وہ دن نیاز کے کہ جب میں بے نیاز تھی

غرض وہ دن خیال تھا کہ اب نہ جائیں گے کبھی

چلے گئے کچھ اس طرح کہ پھر نہ آئیں گے کبھی

غضب یہ ہے شباب میں مرا سہاگ لٹ گیا

سفر میں تھا جو ہم سفر اُسی کا ساتھ چھٹ گیا

یہ سچ ہے مجھ غریب کا کوئی رفیق اب نہیں

یہ سچ ہے غم نصیب کا کوئی شفیق اب نہیں

نغاں میں اب وہ جوش ہے کہ جس کی انتہا نہیں

جگر میں اب وہ درد ہے کہ جس کی کچھ دوا نہیں

خیال ہے خزاں میں بھی مجھے اُسی بہار کا

غضب ہے چھوڑتا نہیں فریب انتظار کا

اجل کی ایک شکل ہے یہ درد اس بلا کا ہے

دوا کروں تو کیا کروں کہ وقت اب دعا کا ہے

مری طرح نہ زندگی کسی کی یوں عجیب ہو

نصیب موت ہو اگر تو زندگی نصیب ہو



## محبوب کا آخری خط

اب لیجئے گا پیامِ رخصت	لوہم تو چلے اسلامِ رخصت
داماںِ خیالِ جل رہا ہے	اک سوز میں دل بگھل رہا ہے
رونے پہ بھی آنکھ تر نہیں ہے	اپنی بھی ہمیں خبر نہیں ہے
اس نے بھی دیا نہ کچھ سہارا	گو تلخیِ غم رہی گوارا
راحت تو ہے کم الم سوا ہے	دُنیا کا یہی پس من رہا ہے

قدرت کے یہی ہیں کارخانے	تقدیر کے راز کون جانے
افشا ہوا رازِ عشق سب پر	غنم کوڑی فوقیت طرب پر
دیکھو جسے گھر میں مجھ سے ناراض	کوئی نہیں مرے دل کا تباض
چھپ چھپ کے جو ہو رہی ہیں باتیں	تقدیر کی ہیں یہ ساری گھائیں
کیا وہم نے گل کھلا دئے ہیں	اچھے بھی بُرے بنادئے ہیں
گو صاف نہ کچھ بھی کہہ سکوں گی	رُسوائیاں اب نہ سہہ سکوں گی
لازم ہے یہی کہ زہر پی لوں	مر کر ہی بنامِ عشق جی لوں
مرنے کی خبر جو پاؤ گے تم	رورود کے مجھے بلاؤ گے تم
ظاہر میں تو بے وفا کہو گے	دل سے مرے معتقد رہو گے
لیکن یہ خیال بھی نہ کرنا	اس غنم کا لال بھی نہ کرنا

دُنیا ہے یہ اک سرائے فانی	ہر چیز یہاں کی آنی جانی
گل شاخ پہ خوب لہلہا کے	گرتے ہیں صبا کی چوٹ کھا کے
دستورِ فنا ہے سب پہ حاوی	ہیں شاہ و گدا یہاں مساوی
زبا و کا نہ بدھیلہ جو ہو	یا رند کا شور و الشربو ہو
آواز ہو پھول کی ہنسی کی	گلشن میں چُپک ہو یا گلی کی
ہو ذکیرِ طرب کہ ذکرِ غم ہو	افسانہ بیش ہو کہ کم ہو
مضموم ہر ایک کا فنا ہے	ہر ایک کا منتہا فنا ہے
تم سے تو نظر نہیں چُرائی	ہمت ہے خود اپنی آزمائی
احباب کے پاس کچھ نہ کہنا	جو رنج ہو دل کا دل پہ پہنا
لینا مرے نام کی بلائیں	گھر والے مگر نہ بھید پائیں

کھا کر بھی جگر پہ زخم تازہ      کچھ دُور سے دیکھنا جنازہ  
 ہونا نہ ٹڈھالِ غم نہ کرنا      مرنے کا مرے الم نہ کرنا  
 گو تم کو دیا غمِ جُدائی      معراجِ وفا کی میں نے پائی  
 تم اشک نہ آنکھ سے بہانا      یوں ضبط کی انتہا دکھانا  
 ناکام مراد جا رہی ہوں      لیکن یہ مراد پا رہی ہوں

تم مجھ کو شہیدِ غم کہو گے  
 تم دادِ وفائے حسن دو گے



# سہاگن بیوہ

(شوہر کی دوسری شادی پر پہلی بیوی کے ماترے)

عقد ثانی کے ترانے گاچکیں شہنائیاں

اب تو قسمت ہو چکیں میرے لئے رسوائیاں

اب وہ دولت لٹ چکی میں جس پہ اتراتی رہی

وہ کسی کے ہو چکے ہیں جن کو اپناتی رہی

عشرت فانی جسے کہتے ہیں فانی ہو چکی

نذر اندوہ جوانی نو جوانی ہو چکی

عشرتوں کے تار ماتم کی صدا دینے لگے  
 میرے ارماں مجھ کو مرنے کی دُعا دینے لگے  
 مانگ کا سیندھ ہے یا سوزِ مجبورِ ہی کی آگ  
 میں وہ بیوہ ہوں کہ قائم ہے ابھی جس کا سہاگ

اے مگر تاجِ اے میرے گلستاں کی بہار  
 اے محبت کے امیں اے زندگی کے پاسدا  
 آپ کی برہم مزاجی کا مجھے شکوا نہیں  
 آپ کے دل کو دکھاؤں میں نے سیکھا نہیں

کیوں وقاؤں کو کروں آلودہ فریاد میں  
 دوسری شادی پہ دیتی ہوں مبارکباد میں  
 آپ سے مانگوں میں کیوں اتنا رُخِ خدمتِ کئے صلے  
 اپنی اُلفت کے صلے اپنی حُجرت کے صلے  
 خوب بہلائیں عروسِ نو کا جی بہلائیں آپ  
 کیف میں ڈوبے ہوئے وکشتِ ترانے گائیں آپ  
 تیز ہوں پھر آپ کے جذبات کی رنگینیاں  
 پھر کسی کے ساتھ ہوں گلزار میں گلِ چنیاں  
 مجھ کو بھی ماں باپ سے روتی ہوئی لائے تھے آپ  
 گرم گرم اشکوں سے منہ دھوتی ہوئی لائے تھے آپ

میں نے بھی کچھ سوچ کر چھوڑا تھا گھڑاں باپ کا  
 میں نے بھی دل دے کے پایا تھا سہارا آپ کا  
 رتجلہ وہ اور ارمانوں کے طوفاں یاد ہیں  
 مجھ کو پہلی رات کے وہ عہد و پیمان یاد ہیں  
 یاد ہے اک دوسرے کی غمگساری یاد ہے  
 وصل میں بھی دو دلوں کی بے قراری یاد ہے  
 اے مگر محبوب میری چشم گریاں کی قسم  
 دردِ دل کی حسرتوں کے جوشِ طوفاں کی قسم  
 کچھ کہو کیا آپ کو بھی وہ زمانہ یاد ہے  
 عشق کی رنگینیوں کا وہ فسانہ یاد ہے



آہ وہ راتیں کہاں اب وہ طاقاتیں کہاں  
 آہ وہ رُوٹھے ہوئے دل کی مدارتیں کہاں  
 آہ پھر ظالم محبت مجھ کو بہکانے لگی  
 پھر طبیعت شکوہ سنجی کی طرف جانے لگی  
 آپ میرے دیوتا میری جوانی کے سنگار  
 یہ مری تقدیر ہے جو پھر گئے لیل و نہار  
 فرض ہے میں آپ کی خاطر دعا کرتی رہوں  
 خالقِ عالم کے در پر التجا کرتی رہوں  
 آپ کو حاصلِ دُہن کی ناز برداری رہے  
 اُس کے پر تیم آپ ہوں آپ کی پیاری ہے

ہے یہی تقدیر اگر میری رہوں میں غم نصیب

آپ کی اُلفت کو استقلال کا ہودم نصیب

آپ کی آنکھیں ہوں عشرت کے نظاروں کے لئے

آپ کا باغِ محبت ہو بہاروں کے لئے

میرا حالِ زار ہے مجبوریاں مجبوریاں

ہے بیانِ غم مرا معذوریاں معذوریاں

فرض ہے اُلفت کا جو اس کو نباہوں گی ضرور

اک معافی اپنی تقصیروں کی چاہوں گی ضرور

اے مجھ کو اپنی مجبوری پہ غم کھانے بھی دو

آئی تھی روتی روتی ہوئی جانے بھی دو

# جوگن پھرے اُداس

تق یہ بھوت گلے میں مالا

انگ انگ یوں منتوالا      لوگ کریں اُپہاس      پیابن جوگن پھرے اُداس

نرمل من ہے سُندر مکھڑا

ہائے سنائے اپنا دکھڑا      جا کر کس کے پاس      پیابن جوگن پھرے اُداس

من کا بھید چھپاتی جائے

آنسو پی کر گاتی جائے      مجھے مَن کی پیاس      پیابن جوگن پھرے اُداس

پھولوں کی لُبّاس ہے اس میں

کہنے کو لُبّاس ہے اس میں      جھوٹا ہے لُبّاس      پیابن جوگن پھرے اُداس

# مشققات

بہر حالے کہ بُودم خوش سر و دم  
نقاب از روئے ہر معنی کشودم  
(اقبال)



## رازِ بقا

لوگ کس دُھن میں ہیں غافل دیکھ آنکھیں کھول کر  
 جاپنچ اپنی طاقت پر داز بازو تول کر  
 دیکھ دُنیا میں بسپا ہے ایک جنگِ ارتقا  
 دیکھ آنکھیں کھول کر اووجہ ننگِ ارتقا  
 دیکھ دُنیا کہہ رہی ہے ہر ملا ہر ایک سے  
 جس کو جینا ہو وہ جینے کے لئے ہمت کرے

گرمی رفتار ہی سے زندگی میں جان ہے  
 آج کل ذوقِ عمل ہر ایک کا ایمان ہے  
 ایک سے اک بڑھ کے سرگرمی عیاں ہے دہر میں  
 نوجواں سے چست پیرِ نا تو اں ہے دہر میں  
 صنفِ نازک کی بھی اب دُنیا بدل جانے کو ہے  
 یہ زمانہ اک نرالی چپال چل جانے کو ہے  
 اک تنگ و دو ہے زمانے میں کہ طاقت چاہیے  
 شور ہے ہر سمت عالم میں کہ ہمت چاہیے  
 اک تحریک سا ہے سرگرمِ عمل اجسام میں  
 جان گویا پڑ رہی ہے آج کل اِصنام میں

اوج عزّت پر ارادے مائل پرواز ہیں  
 طور کے جلوے دل پر شوق کے دم ساز ہیں  
 مستند ہیں حوصلے ہمت بڑھانے کے لئے  
 عالم بالا کو بھی نیچا دکھانے کے لئے  
 جو تمنا ہے اُبھرنے کے لئے بے تاب ہے  
 دل نہیں پہلو میں گویا برق ہے سیماب ہے  
 تجھ کو بھی کچھ ہے یہ آگاہی کہ ہے کس حال میں  
 کس قفس میں بند ہے تو قید ہے کس جال میں  
 کچھ سکت رکھتا ہے تو زنجیرِ غفلت توڑ دے  
 او تغافل کیش اس خوابِ گراں کو چھوڑ دے

یاس کی ظلمت میں جینا بھی کوئی جینا نہیں  
 جس کے سینے میں نہیں ہے طُور وہ سینا نہیں  
 وہ تجلی ڈھونڈ جس سے دل میں ہوتا بندگی  
 جو عمل کا درس دے وہ زندگی ہے زندگی  
 اُٹھ کہ دُنیا منتظر ہے کام کی کچھ کام کر  
 خواہشِ آرام ہے تو قبر میں آرام کر  
 تو بھی دُنیا کو دکھا دے اپنی شانِ زندگی  
 تو بھی پیدا کر زمیں پر آسمانِ زندگی  
 منزلِ تاریک طے کر گریں رفتار سے  
 مانگ لے بیدار آنکھیں طالعِ بیدار سے



تیرے بازو میں سکت ہو حوصلہ کچھ دل میں ہو  
 اور کچھ غیبت کا عنقریب تیرے آب و گل میں ہو  
 پھر تجھے حاصل ہو جینے کا مزا او بے خبر  
 پھر نہیں تجھ پر کھلے رازِ بقا او بے خبر

۱۹۳۳

## نعرہ مزدور

مری مشقّت پیہم رہیں یا اس نہیں

ارادہ جوشِ بغاوت کا بے اساس نہیں

سیاستِ اہلِ زمانہ کی مجھ کو اس نہیں

مرا سیاستِ اہلِ جہاں کو پاس نہیں

چل آ سیاستِ اہلِ جہاں سے جنگ کریں

مجھے اسیرِ ستھائے روزگار کیا

مری بہار کو بیگانہ بہار کیا

وقار مجھ سے لیا مجھ کو بے وقار کیا

مجھے سیاستِ اہل جہاں نے خوار کیا

چل آ سیاستِ اہل جہاں سے جنگ کریں

یہ شہریار کا عالم فریبِ حکمِ سجدہ

یہ سلطنت کے فرامینِ شیطنتِ آلود

یہ عز و حباہ کی دُنیا یہ مسکنِ مردود

سیاستِ اہل جہاں کی فریبِ نام و نمود

چل آ سیاستِ اہل جہاں سے جنگ کریں

یس ایک شیر نیستیاں شغال سے بھی حقیر  
 فریب اہل زمانہ کے دام میں ہوں اسیر  
 مرے ہو سے ہیں پلتے وزیر بے تدبیر  
 سیاست اہل جہاں کی مرے ہو کا خمیر  
 چل آ سیاست اہل جہاں سے جنگ کریں  
 خرد کا شعبدہ صورت گرہن دار آئیں  
 خرد کے در پہ مشقت کی سجدہ ریز جہیں  
 خرد زمانے کی وحشت طرازیوں کی ہیں  
 سیاست اہل جہاں کی خرد کا دام حسیں  
 چل آ سیاست اہل جہاں سے جنگ کریں



چل آحقیقتِ قلبِ تپاں بدل ڈالیں  
 چل آحسابِ دلِ دوستاں بدل ڈالیں  
 خموشیِ غم و دردِ تہاں بدل ڈالیں  
 چل آسیاستِ اہلِ جہاں بدل ڈالیں  
 چل آسیاستِ اہلِ جہاں سے جنگ کریں  
 جو گر رہی ہے عمارتِ سنبھل ہی جائے گی  
 مصیبتِ سرِ مزدور ٹل ہی جائے گی  
 یہ جبر و ظلم کی زنجیر گل ہی جائے گی  
 سیاستِ اہلِ جہاں کی بدل ہی جائے گی  
 چل آسیاستِ اہلِ جہاں سے جنگ کریں

# امیروں کی دُنیا

کسی کی طبیعت میں پندارِ ہستی      کسی کو غم و رنجوانی کی مستی  
کوئی مستِ میخانہٗ خود پرستی      امیروں کی دُنیا تکبر کی پستی

فریبوں کے سائے میں ڈیرا ہے ان کا

گناہوں کے گھر میں بسیرا ہے ان کا

کوئی اپنے زورِ حکومت پہ نازاں      کوئی مالِ دولت کی کثرت پہ نازاں

کوئی اپنے ایوان کی فحشیت پہ نازاں      کوئی حشمتِ جاہ و ثروت پہ نازاں

وہ نشہ چڑھا ہے کہ بھولا خدا بھی

یہ سنتے نہیں بے کسوں کی دُعا بھی

جو تباہ شے ہو اسے ٹھونڈ لائیں جو مرغوب خاطر ہو وہ چیز کھائیں

جو گرمی کو چاہیں تو سردی بنائیں اُنہیں پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوائیں

زمانے میں چلتی اگر ہے تو ان کی

یہاں وال گلتی اگر ہے تو ان کی

ہے دشوار ان کو بندی نہ پستی امیروں کی دنیا میں مہنگی بھی سستی

نہ بھی انہوں نے کبھی فسادِ مستی یہ ہیں بے نیازِ غم تنگ دستی

یہ مفلس کی مشکل کو کیا جانتے ہیں

یہ نادار کو خاک پہچانتے ہیں

گذرتی ہے شب جو ہو سُنائیوں میں تو گھٹتا ہے دنِ فتنہ سامانیوں میں

یہ ہیں مست اپنی تن آسانیوں میں زمانہ ہے ان سے پریشانیوں میں

غریبوں کے حق میں بلا بننے والے

یتیموں کے حق میں قضا بننے والے

زمانہ ہو زچ جس سکہ چال کر دیں جو ممکن ہو دنیا کو پال کر دیں

اگر ہو سکے سب کو کنگال کر دیں جو خوش حال ہوں ان کو بدل کر دیں

غرض ان کے دل ہیں محبت سے خالی

اخوت سے خالی عنایت سے خالی

جو بولے کوئی تو زباں کاٹ ڈالیں جو دیکھے کوئی اس کی آنکھیں نکالیں

نہیں ان سے ممکن کسی کو سنبھالیں کوئی مر رہا ہو تو اس کو بچالیں

مگر شکر ہے عرش فضل خدا کا

وہ خلاق حافظ ہے ہر بے نوا کا



# عرضِ حقیقت

مری فطرت میں گو موجود ہیں جذباتِ طوفانی

نہرالا ہے جہاں سے گو مرا ذوقِ سخنِ رانی

مری کوشش ہے گو میں منظم کو سلاکِ گہرِ کردوں

مری خواہش ہے گو اشعار کو پاکیزہ تر کروں

مجھے گواک زمانے سے نہرالی دُھنِ سمائی ہے

مگر خارجِ مرے رستے میں میری بے نوائی ہے

گرفتارِ غمِ بستی اسیرِ فقرِ پستی ہوں  
 جو بس بس کر اُجڑ جائے میں وہ برباد بستی ہوں  
 دیا فطرت نے بہرہ جس قدر روشن خیالی کا  
 اُڑایا اس قدر حصہ مری آسودہ حالی کا  
 نہ شکوہ ہے مقدر کا نہ قسمت کی شکایت ہے  
 مجھے صبر و رضا کی راہ پر چلنے کی عادت ہے  
 جنوں شعر گو ایک آئینہ ہے ہوشمندی کا  
 مگر اُلٹا ہے اس میں عکس میری سربلندی کا  
 اگر چاہوں تو ذرے میں ضیا خورشید کی بھر دوں  
 اگر چاہوں خرف کو آب میں رشکِ گہر کر دوں

اگر چاہوں تو قطرے کو سمندر کہہ دکھاؤں میں  
 اگر چاہوں بگولابن کے صحر اکو اڑاؤں میں  
 اگر کہنے پہ آجاؤں بقا کو لافنا کہہ دوں  
 زمیں کو عرش کہہ دوں عرش کو تخت الثرئے کہہ دوں  
 اگر ہر جھوٹ سچ کہنے پہ آجائے زباں میری  
 روانی میں بڑھے گنگا سے بھی طبع رواں میری  
 خوشامد کی ریاکاری سے لیکن دُور رہتا ہوں  
 میں ہوں مجبورِ فطرت اس لئے معذور رہتا ہوں  
 یوں نہیں درد پہ مجھ کو جبہ س ہونا نہیں آتا  
 مری خود داریوں کو مُفت کا رونا نہیں آتا

# خِراِبَات

در خراباتِ مُغال نورِ خُدا می بینم  
وِیں عجب ہیں کہ چہ نورِے ز کجایِ بینم  
(حافظ)



# ایسے پیر خرابات

رندوں کو ترے دم سے یہ حاصل ہیں کمالات  
 آیات سے ہرگز نہیں کم ان کے حکایات  
 جام ان کا وظیفہ ہے صراحی ہے مناجات  
 اسرار جہاں کھولتی ہے ان کی ہر اک بات

منجملہ اربابِ کرامت ہے تری ذات      ایسے پیر خرابات

جامِ مے گُلگوں ہے تجلی گہ صد طور  
 ظلماتِ جہالت کو یہ کہہ دیتا ہے کا نور  
 خاکِ درِ مے خانہ کا ہر ذرہ ہے پُر نور  
 ہر گوشہ یہاں روشنی عقل سے معمور

اے پیرِ خرابات اٹھتے ہیں یہاں آ کے تو ہم کے حجابات

خردی و بزرگی کی یہاں جنگ نہیں ہے  
 پستی و بلندی کا کہیں رنگ نہیں ہے  
 ہر دل ہے کشادہ کوئی دل تنگ نہیں ہے  
 جھگڑوں کی بنا رسل نہیں رنگ نہیں ہے

اے پیرِ خرابات رندوں نے ترے فیض سے سیکھی ہے مساوات

مکن ہی نہیں یہ کبھی تجھ سے ہوں ہم دُور  
 رہتے ہیں ترے دم سے زمانے کے ستم دُور  
 ہوتا ہے ترے قول سے ماحول کا غم دُور  
 کرتی ہے تری بات وراثت کا اَلَم دُور

صادق تر اہر قول ہے برحق تری ہر بات      اے پیرِ خرابات  
 کیوں رکھا ہے چہرے کو حقیقت کے چھپا کر  
 یہ چہرہ دکھا دے ہمیں پردوں کو ہٹا کر  
 اسرارِ جہاں کھول دے اک جامِ پلا کر  
 دُنیا ہے بڑے تیج میں اس راز کو وا کر

یہ دائرِ عمل ہے کہ ہے یہ دائرِ مکافات      اے پیرِ خرابات

مکن ہی نہیں تجھ سے کریں زندگنارا  
 پینے کا سہارا ہے تو جینے کا سہارا  
 تُو ہے تو ہر اک تلخیِ دوراں ہے گوارا  
 واللہ ترے کُطف کا اُٹنا سا اشارا

ان کے لئے ہے مایہِ صد فخر و مباہات  
 اے پیرِ خرابات  
 دُنیا کے ڈرانے سے کبھی ہِسم نہ ڈریں گے  
 اُمید کا دامنِ تری بخشش سے بھریں گے  
 سجدہ ترے در پہ ہی کریں گے جو کریں گے  
 جیتے ہیں اسی در پہ اسی در پہ مریں گے

ہر حال میں سمجھیں گے تجھے قبلہ حاجات  
 اے پیرِ خرابات



# رباعیات

ساقی نے کیا دورِ مئے ناب شروع

بھاگیں مری محفل سے سجود اور رکوع

گل کرد و ذرا شمعِ سرِ مے خانہ

ہوتا ہے مرے جام سے خورشیدِ طلوع

رندوں سے یہ نفرت یہ کدورت بے کار

آلودہ تقدیس نہیں یہ زہنِ سار

نہرہ سے کہو آئے زمیں پر ناچے

انساں ہیں فرشتے نہیں ہرگز میخوار

ساقی ہنس وُنیا سے حذر جام پلا  
 مرنے کا نہیں مجھ کو خطر جام پلا  
 جینے کی دُعا ئیں جو ہر گوں سے ملیں  
 لے وہ بھی تری نذر، مگر جام پلا

حد کہ نہ مقرر مری بے ہوشی کی  
 کچھ شرم بھی رکھ اپنی خطا پوشی کی  
 پایاں کرم ایک فقط ایک ہی جام  
 توہین نہ کر میری بلا نوشی کی

بچھڑے ہوئے احباب جو مل جاتے ہیں  
 چاکِ دلِ افسردہ بھی سل جاتے ہیں  
 پی کر جو نکل جاتا ہوں میں سوئے چمن  
 غنچے مری تعظیم میں کھل جاتے ہیں

بادہ ہے کہ ہے نسخہٴ تسخیرِ قلوب  
 بوتل ہے بغل میں کہ ہے وصلِ محبوب  
 یوں ملتے ہیں لبِ جامِ مئےِ احمر سے  
 خورشید و شفق جیسے یہ ہنگامِ غروب

اک جام مجھے بہرِ خداے ساقی  
 پر دے سے ذرا سا منے آے ساقی  
 مطرب جو نہیں چھیڑ تو ہی اک نغمہ  
 ہے گوشِ بر آوازِ فضا اے ساقی

مجھ رند کو بخشی جو شراب اے ساقی  
 دنیا میں نہیں ترا جواب اے ساقی  
 ہر قطرہ مرے حق میں کرم کی بارش  
 اب جام کا تو کر لے حساب اے ساقی



ساقی نے کہا غیبتِ ناہید ہوں میں  
 مے بول اٹھی جلوۂ اُمید ہوں میں  
 ساعز سے چھلک کر جو زمین تک پہنچی  
 ہر ذرہ پکار اٹھا کہ خورشید ہوں میں

مغرب سے اُمنڈتے ہوئے بادل آئے  
 بھیگی ہوئی رُت اور سہانے سائے  
 ساقی، لبِ جو، مطرب، نوخیز، شراب  
 ہے کوئی جو واعظ کو بلا کر لائے

رندی ہے تو پھر کیفِ غم ہستی کیوں  
 یہ محضہ بیش و کم ہستی کیوں  
 اک لے پہ تو اس ساز کو بج لینے دے  
 یہ واہسمہ زیر و بم ہستی کیوں

ساقی یہ توقف یہ تساہل کب تک  
 خاموشی ہنگامہ قفل کب تک  
 باتوں کے نہیں ہم ہیں عمل کے قائل  
 یہ سہل پسندی یہ توکل کب تک

رندوں کے لئے منزلِ راحت ہے یہی  
 میخانہ پُر کیفِ مُسرت ہے یہی  
 پی کر تو ذرا سیرِ جہاں کر اے شیخ  
 تو ڈھونڈتا ہے جس کو وہ جنت ہے یہی

ہر طرف کو اندازے سے تول اے ساقی  
 یخِ نسل بھرے بول نہ بول اے ساقی  
 مے اور تری تلخ نوائی تو بہ  
 یہ زہر نہ اس شہب میں گھول اے ساقی

فردوس کے چشموں کی روانی پہ نہ جا  
 اے شیخ تو جنت کی کہانی پہ نہ جا  
 اس وہم کو چھوڑ اپنے بڑھاپے ہی کو دیکھ  
 حورانِ بہشتی کی جوانی پہ نہ جا

تو آتشِ دوزخ کا سزاوار کہ میں  
 تو سب سے بڑا ملحد و عیار کہ میں  
 اللہ کو بھی بنا دیا حور فروش  
 اے شیخ بتا تو ہے گنہگار کہ میں



# دور چلے

غم کا اب فکر ہی کیا دور پہ اب دور چلے      ساقیا اور چلے اور چلے اور چلے  
 مے کستو پیئے پلانے میں تو قف کیسا      دور چلنا ہی جو لازم ہے تو فی الفور چلے  
 چھوڑتا ہی نہیں ابد مے کو تر کا خیال      اپنا جاؤ جو چلے اس پہ تو کس طوہ چلے  
 دے کبھی جام کبھی اوک ہی بھر دے ساقی      دور ساون کے مہینے میں بہہ ہو طوہ چلے

اُن سے کہہ دو کہ نہ اب رحم کریں شہ پڑوہ

بند پھر کیوں ہو اگر سلسلہ جوہ چلے

# جھوم کے پنی

ساعنر کا منہ چوم کے پنی      جھوم کے پنی مے جھوم کے پنی  
 رقص میں آئے میخانہ      بے تابی سے گھوم کے پنی  
 دور جہاں کا ایسا ہے      مستی میں آ جھوم کے پنی  
 نشہ کہاں آداب کہاں      ساقی کا منہ چوم کے پنی  
 جام اٹھا اور وجد میں آ      بادل آئے جھوم کے پنی  
 رت ہے آج بہکنے کی      واعظ کا منہ چوم کے پنی

عرش سے کل جواتری ہے

آج تو اس کو جھوم کے پنی

ہو جوانی میں عار پینے سے      موت اچھی ہے ایسے جینے سے  
 مے کشو احترامِ ساقی میں      جام و مینا دھرو قرینے سے  
 واہ رے ضبط پھنک گیا دل بھی      آہ نکلی مگر نہ سینے سے  
 کوئی موسم ہو کوئی ساقی ہو      ہم کو مطلب فقط ہے پینے سے  
 چوٹ کھائے جگر تو یہ جانو      موج ٹکرائی ہے سفینے سے  
 آگینے میں ڈھال اے ساقی      اپنی آنکھوں کے آگینے سے  
 میری تو بنے ٹوٹ کر یہ کہا      زندگانی بڑھے گی پینے سے  
 کیوں نہ ہو شوقِ جام ساون میں      مے کو نسبت ہے اس مہینے سے

کیا پئے گا جو بے پئے اے عرش

تر ہے تیری حبس پسینے سے

# گیت

مُطرب کُجاست تا ہمہ محصول زُہد و عِلم  
در کارِ بانگِ بربط و آوازِ نئے کُنم  
(حافظ)



# کسان کا گیت

چل میرے گورے چل، چل، چل

رازق ہے وہ خالق سب کا      میرا بھی اس سے ہے سا جھا  
دیتے ہیں دُنیا کو روزی      اس کی زمیں اور میرا ہل

چل میرے گورے چل، چل، چل

سا ہو کار اور گھوڑے ہاتھی      تو میرا میں تیرا ساتھی  
محنت سے ہم کرائیں کیوں      محنت ہے محنت کا پھل

چل میرے گورے چل، چل، چل

دُنیا کی ہر دولت ہم سے      کھانے کی ہر نعمت ہم سے

دیتے ہیں جسموں کو طاقت تیری شکتی میرا بل

چل میرے گورے چل چل چل

محنت کو آفت نہ سمجھ تو خدمت کو زحمت نہ سمجھ تو

مان ہمارے دکھ سہنے کا آج نہیں تو ہوگا کل

چل میرے گورے چل چل چل

۱۹۳۹

چھوڑ بھی دے اوکھیون ہار

کھینے بھی دے مجھ کو نسیا اپنا ہوں میں آپ کھویا

لاکھ ڈرائس میرے من کو یہ ساگہ اور یہ منجھار

چھوڑ بھی دے اوکھیون ہار

تند تھپیڑے سہہ لینے دے      اپنی موج میں بہہ لینے دے  
 لے جانے دے اپنی کشتی      ان طوفانوں کے اُس پار  
 چھوڑ بھی دے او کیوں ہار

طوفانوں نے ہاتھ بڑھائے      جیون نیٹا ڈوبی جائے  
 مجھ پر ہی چلنے کی خاطر      ہر اک موج بنی تلوار  
 چھوڑ بھی دے او کیوں ہار

اپنی نیٹا اپنی دھارا      دُور ہو یا نزدیک کتارا  
 یسنگرام مجھے لڑنے دے      جیت ہو اس میں یا ہو ہار  
 چھوڑ بھی دے او کیوں ہار

# میرے من کی آشا جاگ

من کا منور تھل جائے گا      من کا کنول بھی کھل جائے گا  
 من کی منڈیر پہ بول رہا ہے      کلپن روپی کاگ  
 میرے من کی آشا جاگ

ندرا کا سُکھ موت کا سُکھ ہے      ندرا میں تو دکھ ہی دُکھ ہے  
 رین نہیں اب ہوا سویرا      اٹھ ندرا کو تیاگ  
 میرے من کی آشا جاگ

قسمت کے پیٹے بھی جاگے      ندرا کے پیٹے بھی جاگے  
 تُو جاگے تو پھر کیا کہنا      جاگ اٹھیں گے بھاگ  
 میرے من کی آشا جاگ



من میں ایسی کے بس جائے      ناگن بن کر جو ڈس جائے  
 نے کا زہر چڑھے نس نس کو      چھیڑ دے دیپک واگ  
 میرے من کی آشا جاگ

۱۹۴۲

## اندھا بنیائے

اندھا جگ کا بنیائے رے منو اندھا جگ کا بنیائے  
 سونے چاندی کی پوجا میں اندھے ہیں مہنواں  
 ان کی نگری میں ہوتا ہے نردھن کا ایمان  
 ہم سے سہانہ جائے رے منو اندھا جگ کا بنیائے  
 دھرم کے پلے ہار ہے نرسن پاپ کے پلے جیت

گن وانوں کو کوئی نہ پوچھے لیش مورکھ کا میت  
ہم سے سہا نہ جائے رے منوا اندھا جگ کا نیا  
سُکھ کے کان نہیں سنتے ہیں دکھ کا کرنِ وِلاپ  
مرنے سے بھی کچھ بڑھ کر ہے جیون کا سنتاپ  
ہم سے سہا نہ جائے رے منوا اندھا جگ کا نیا

۱۹۴۲

## نردھن کا دکھ جانے کون

نردھن کا دکھ ہے بھاری	لو بھی ہیں سارے سنساری
نردھن کا دکھ جانے کون	اس دکھ کو پہچانے کون
نردھن ہے تو ہے دھن والا	زین ہے تو ہے دن کا اُجالا
نردھن کا دکھ جانے کون	لیکن اس کو مانے کون

سُکھ کے راگ دھنی گاتے ہیں      دھن کے بدلے سُکھ پاتے ہیں

دُکھ کی کتھا بکھانے کون      نردھن کا دُکھ جانے کون

۱۹۴۴

## من کی بات

پِلڈنڈی کی بھول بھلیاں بھیانک کالی رات

بادل گرے بجلی کرٹکے اور بھری برسات

ایسے میں اپنے ساجن کو ڈھونڈت ڈھونڈت ہاری

من کی بات سناؤں کس کو کون سُننے گا من کی بات

دیس میں رہ کر اب کیا لوں گی پیانگے پر دیس

تن پر راکھ ہے ہاتھ میں مالا جو گن کا ہے بھیس

پریتم میرا سب سے نیارا میں پریتم سے نیاری  
 من کی بات ہے مجھ سے نیاری من میں کھوں من کی بات

ساگر سے ملنے پر ندی پاتی ہے بسرام  
 ساجن مجھ کو آپ ملے گا کھوج ہے میرا کام

اپنے آپ میں آؤں گی میں کھو کر سدھ بدھ ساری  
 ساجن من کی بات سنے گا اس سے کھوں گی من کی بات  
 ۱۹۴۱

## ہمارا دلش

دلش ہمارا سب سے نیارا سب سے پیارا دلش ہمارا



پُورب پچھم دکھن اُتر

اُونچے پر بت گہرے ساگر

شو بھا سے بھر ٹوپہ یہ مندر

شو بھا اس کے باہر اندر

اصغر، اکبر، شیا، منوہر      بل کر گائیں گیت یہ پیارا

دلش ہمارا سب سے نیارا      سب سے پیارا دلش ہمارا

بن برکھا نہروں سے جل تھل

چو کھی کھیلتی سبزی اور پھل

ہریا لے ہریا لے جنگل

جنگل جن میں ہر دم منگل

نغمہ، زہرہ، چپلا، چنیل، بل کر گائیں گیت یہ پیارا

دیش ہمارا سب سے نیارا سب سے پیارا دیش ہمارا

اس کی خاطر واریں تن من

اس پہ نچھاؤ سب مال اور دھن

اس کے نام کو کہ دیں روشن

خوب پھلے پھوڑے یہ گلشن

رجنی، راشد، سلمیٰ، موسیٰ، بل کر گائیں گیت یہ پیارا

دیش ہمارا سب سے نیارا سب سے پیارا دیش ہمارا

## پن گھٹ

چل ری سکھی ننگھٹ پر جائیں گا گریا بھر لائیں  
 بھور بھئی اب بچھی جاگے آشاکي دھن گائیں  
 چل ری سکھی ننگھٹ پر جائیں گا گریا بھر لائیں  
 نیند کے ماتے جاگ اٹھے ندیا نے لی انگڑائی  
 نین اگھارے پریم دوس نے اوشا بھی مسکائی  
 شو بھا کا یہ نرمل درپن دکھیں اور مسکائیں  
 چل ری سکھی ننگھٹ پر جائیں گا گریا بھر لائیں  
 کھائے رہی ہے شیت پون سے ہر ڈالی تھپکولے  
 جائے رہی ہیں سکھیاں سب اٹھلاتی ہوئے ہوئے

اُو چلیس ہم بھی سنگ اُن کے ٹھمک ٹھمک بل کھائیں

چل رہی سکھی ننگھٹ پر جائیں گا گریا بھر لائیں

پیر کے نیچے گاتا ہے جو روز ریلی تائیں

اُو اُس کے من کو جیتیں اُس سے ہار نہ مانیں

شرمانے کی بات نہیں کچھ مفت میں کیوں شرمائیں

چل رہی سکھی ننگھٹ پر جائیں گا گریا بھر لائیں

۱۹۴۲

## دیپک تلے اندھیرا

دیپک جگ میں کرے اُجالا دیپک تلے اندھیرا

ہر سہا تھی ہے شکھ کا سہا تھی کوئی نہیں ہے دکھ کا سہا تھی

میں کہتا ہوں میں ہوں سب کا کوئی نہیں ہے میرا



دیک جگ میں کرے اُجالا دیک تلے اندھیرا

مرگ ترشنا ہے منزل میری جیون ہے اک رات اندھیری

دیکھ نہیں سکتیں یہ آنکھیں آشا روپ سویرا

دیک جگ میں - - - - -

چنتا میں گھٹل گھٹل کر مرنا اپنے ہی سائے سے ڈرنا

من کی بستی ٹوٹی میں نے میں ہوں آپ ٹھیرا

دیک جگ میں - - - - -

چنتا دُبدھا 'شنگا' کلین اس پہ پکاروں ساجن ساجن

ساجن من سے دُور ہر اوج من ساجن کا ڈیرا

دیک جگ میں - - - - -

# جیون کا درپن دیکھ لیا

دکھ سکھ کی تصویریں اس میں

خوابوں کی تعبیریں اس میں

امید بھرا من دیکھ لیا

تدبیریں تقذیریں اس میں

جیون کا درپن دیکھ لیا

کچھ آقا بھی کچھ بندے بھی

کچھ مکر و ریا کے پھندے بھی

دُنیا کا ہر فن دیکھ لیا

لاچ کے گورکھ دھندے بھی

جیون کا درپن دیکھ لیا

کانٹے اس میں ہیں گل اس میں  
 صیاد اس میں کلبیل اس میں  
 زہر اس میں شراب و مل اس میں

یہ نیارا گلشن دیکھ لیا  
 جیون کا درپن دیکھ لیا

کچھ اس سے عیاں خوش حالی بھی  
 کچھ اس میں نہاں پایالی بھی  
 بھر پور بھی ہے اور خالی بھی

آشا کا دامن دیکھ لیا  
 جیون کا درپن دیکھ لیا

